اردو
اور
عوامی ذرائع ابلاغ

مرتبین: محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی

اردو اکادمی دہلی

اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ

(سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل)

مرتبین

پروفیسر محمد شاہد حسین

اظہار عثمانی

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی، دہلی نمبر ۱۴۳

URDU AUR AWAMI ZARAEY ABLAGH

Edited by

Prof. M. Shahid Hussain
Izhar Usmani

Published by
URDU ACADEMY, DELHI

Print
2007

Rs. 75/-

ضابطہ

سنِ اشاعت
۲۰۰۷ء

پچھتّر روپے

اے۔آر۔انٹرپرائزز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-143-7

فہرست

ریڈیو

سنیما

ٹیلی ویژن

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گردونواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشوونما پاکر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کررہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئر مین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئر مین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ

ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرون دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی نے اس موضوع پر ایک سہ روزہ سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ موضوع کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین اور جناب اظہار عثمانی کی مشترکہ کوششوں اور کاوشوں نے اس کتاب کو ایک ایسی دستاویزی شکل دے دی ہے کہ صحافت یا ذرائع ابلاغ پر کام کرنے والے طالب علموں اور اس میدان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے یہ ایک مشعلِ راہ کا کام کرے گی۔ اکادمی دونوں مرتبین کی شکرگزار ہے کہ انھوں نے اکادمی کے ذخیرے میں ایک گراں قدر کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

پیش لفظ

ابلاغ ایک دوطرفہ سماجی عمل ہے جو انسانی معاشرے میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ معاشرہ ہی ابلاغ کا دائرہ ہے اور یہی اس کی تنظیم کرتا ہے۔

ابلاغ بنیادی طور پر عربی لفظ ہے جس کا مفہوم بھیجنا یا پہنچانا ہے۔ اردو میں یہ انگریزی لفظ (COMMUNICATION) کمیونیکیشن کی جگہ استعمال کیا جارہا ہے جو لاطینی لفظ کمیونس سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں کامن یعنی مشترک۔ جب ہم کسی جذبے، خیال، معلومات یا محسوسات کو دوسروں تک بھیجتے ہیں تو اسے مشترک کرتے ہیں۔ گویا اس میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ چنانچہ خیالات، تجربات ومحسوسات میں دوسروں کو شریک کرنے کا عمل ابلاغ کہلاتا ہے۔ ابلاغ کی ایک سادہ سی تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ ابلاغ اطلاعات، خیالات اور معلومات کو ایک انسان سے دوسرے انسان تک پہنچانے کا فن ہے۔

ابلاغ کی بنیادی طور پر چار قسمیں بتائی گئی ہیں۔

1. غیر کلامی ابلاغ (NON-VERBALCOMMUNICATION)
2. درون ذاتی ابلاغ (INTRAPERSONAL COMMUNICATION)
3. بین شخصی ابلاغ (INTERPERSONAL COMMUNICATION)

4. عوامی ابلاغ (MASS COMMUNICATION)

اس میں آخری دو بنیادی اور اہم ہیں۔

چنانچہ بین شخصی ابلاغ ایک ایسا طریقہ کار ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان دو بدو زبانی یا دوسرے طریقے سے ابلاغ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ ابلاغ ذاتی ہوتا ہے۔ براہ راست ہوتا ہے۔ قریب سے ہوتا ہے اس میں سورس اور ریسیور کے اختلاط کی گنجائش بہت زیادہ رہتی ہے۔ چنانچہ روزمرہ زندگی میں ہم راہ چلتے بات کرتے یا کسی سے ملتے وقت کسی نہ کسی طرح ابلاغ کے دائرے میں رہتے ہیں۔ لیکن یہاں خیالات کا مکمل اظہار یا اس کی ترجمانی نہیں ہو پاتی اور نہ ہی اس میں مناسب تسلسل وتوازن ہوتا ہے۔ چنانچہ خیالات تجربات اور اطلاعات کو زیادہ ترتیب وار مکمل اور بھرپور طریقے پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے عوامی ابلاغ کے عمل واصول کا سہارا لیا جاتا ہے۔ عوامی ابلاغ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔

> Delevering information, ideas, and attitudes to a sizable and diversified audience through use of a media developed for that purpose."

اس بات کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ عوامی ابلاغ کے ذریعے اطلاعات ،خیالات، تجربات ،فکر ونظریات ،علوم وفنون ،تفریحی مواد، حالات حاضرہ ،عوامی مسائل اور دیگر بہت سی چیزوں کو ایک بڑے اور مختلف النوع انسانی گروہ تک بیک وقت کسی ایسے ذریعے سے پہنچایا جائے جو اسی کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔ عوامی ابلاغ کے ذرائع مختلف ہیں۔ اس کے دائرے میں جو چیزیں آتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

> "It is because Telegraphy, Telephones, Mail and books etc are not media of Mass Communication since the target in Mass Communication, is ultimatly a vast,

hetrogenous and ananimous audience, which they do not cover."

مختصر یہ کہ ہم ان ہی چیزوں کو عوامی ابلاغ کے ذرائع مانتے ہیں جو فنی اور تکنیکی طور پر پیغامات کو عوام کے بڑے گروہ تک بیک وقت پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں۔

1. سورس (SOURCE)
2. میسج (MESSAGE)
3. چینل (CHANNAL)
4. ریسیور (RECIEVER)
5. فیڈ بیک (FEED BACK)
6. بیریر (BARRIER)

مزید یہ کہ ابلاغ کے تدریجی ارتقا پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ بنیادی طور پر ابلاغ کے آغاز کی کہانی زبان کی ابتداء سے جڑی ہوئی ہے چنانچہ ایک لاکھ سال ق م سے پہلے ایک ایسی غیر ترقی یافتہ زبان (EMBRYONIC) کی ابتداء ہوئی جس کے ذریعے ترسیل کی جاسکتی تھی۔ اس سے پہلے انسان لمس یعنی چھوکر یا دوسرے حواسی شعور کے ذریعے ابلاغ کرتا تھا۔ بہر حال جب مکمل طور پر بولے جانے والے الفاظ وجود میں آگئے تو یہ انسان کی ایجاد کردہ چیزوں میں سب سے اہم اور قیمتی ثابت ہوئی۔ زبان ہی کے استعمال سے انسان کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی مفید ومہذب صورتیں پیدا ہوئیں اور اسے اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل ہوئے جو روئے زمین پر دوسرے جانداروں کو حاصل نہ تھے یعنی وہ حیوان سے حیوان ناطق بن گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ زبان خیالات وجذبات کے اظہار کا اولین ذریعہ ہے لیکن ناقص، کیوں کہ یہ بہت دور نہیں جاسکتی یہ قائم رہنے والی بھی نہیں۔ تاریکی اور درمیان میں کسی چیز کے حائل ہونے کی صورت میں اشاراتی گفتگو بھی ناممکن ہوجاتی ہے۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں ہی انسان نے ضروری باتوں کی یادداشت محفوظ رکھنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت کے تحت تحریر کی ایجاد کی۔ تحریر نے انسان کے منھ سے نکلی ہوئی باتوں کو ہوا میں گم ہوجانے سے بچالیا۔ اس نے زبان کو ایک ایسا منقش علامتی

جسم عطا کیا جسے پا کر وہ جاوداں اور متحرک ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور اطالوی عالم ڈاکٹر ڈرنگر نے اسے تہذیب انسانی کی کلید سے تعبیر کیا ہے۔

فن تحریر اور سامان تحریر کے ارتقاء سے ترسیل وابلاغ کو جو ترقی ملی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل تک اس کا دائرہ بہر حال محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چین نے 104ء میں کاغذ تیار کرلیا تھا۔ مگر سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا۔

کاغذ کی ایجاد کے بعد کسی تحریر کو محفوظ کرنے میں کافی آسانی ہوگئی۔ پھر بھی کاغذ پر ہاتھ سے تحریریں محدود پیمانے پر ہی لکھی جاسکتی تھیں۔ اور ان کی زیادہ کاپیاں تیار کرنا کافی دقت طلب تھا۔ چنانچہ چھاپے خانے کی ایجاد نے کاغذ کی ایجاد کو ایک وسیع پس منظر عطا کیا۔ چھپائی کی ایجاد کے بعد تحریری ابلاغ میں لامحدود وسعت پیدا ہوگئی۔ کاغذ کی ایجاد کی طرح چھپائی کی ایجاد کا سہرہ بھی کسی حد تک چین کے ہی سر ہے۔

لیکن اس ذریعہ ابلاغ میں یہ کمی تھی کہ اس سے صرف خواندہ طبقہ ہی استفادہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مطبوعہ مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ مزید یہ کہ تحریر میں تقریر کا تاثر، تحرک، توثق، لہجے کا زیر و بم اور جذبات کا ظہور پنکچوئیشن کی تمام تر پابندیوں کے باوجود کہیں گم ہوگیا تھا۔ چنانچہ سائنسدانوں نے بے وزن، آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی جانے والی تیز رفتار اور جذبات کی شدت سے لیس آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کی طرف توجہ دی، اور اس کی ابتداء ہوئی ٹیلی گراف سے۔ ٹیلی گراف میں تار کی لائن کے ذریعے کچھ آوازی اشارے ہی ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجے جاتے تھے۔

ٹیلی گراف میں لاسلکی ذرائع سے اشاراتی پیغام کو لمبے لمبے فاصلوں تک بھیجنے کا مظاہرہ ہوگیا تو اسی طرز پر بہت سے ملکوں میں سائنس داں آوازی اشاروں کے بجائے انسانی آواز یا کسی آواز کو ہو بہو لاسلکی ذرائع سے بھیجنے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ اس میں سب سے پہلے کامیابی گراہم بیل کو ملی اور اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹیلی

فون سے جڑ گیا۔

ابھی تک جو چیزیں برقی ابلاغ کے لیے استعمال ہو رہی تھیں ان میں ''وائر'' یعنی ''تار'' کا استعمال ہو رہا تھا مگر اب ایسا طریقہ ایجاد ہوا جس میں ''وائر'' کا استعمال لس (LESS) یعنی ترک ہو گیا۔ یعنی وائرلس وجود میں آیا اور پیغام ہوا کے ذریعے بھیجا جانے لگا۔

وائرلس کی ایجاد ایک ایسی اہم اور بنیادی ایجاد تھی جس کی وجہ سے نہ صرف ابلاغ زمین کی پستیوں سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا بلکہ اسی کی وجہ سے ریڈیو، ٹرانسیسٹر، ٹیلی ویژن اور ترسیلی سیٹیلائٹ کی کامیابی ممکن ہو سکی۔ اسی کی وجہ سے فاصلے سمٹ گئے، وقت پر قابو پالیا گیا۔ لیکن ابھی تک پیغام کوڈ (CODE) یعنی مخصوص اشاروں کے ذریعے ہی بھیجے جاتے تھے۔

ہوا کے ذریعے آواز کو ہو بہو بھیجنے کی کوشش میں کامیابی مارکونی کے نام سے منسوب ہے مگر اسے ترقی دینے میں کئی دوسرے سائنس داں بھی شامل تھے۔

ریڈیو کی ترقی یافتہ شکل ٹرانسیسٹر ہے جسے 1947 میں ڈاکٹر ولیم شاکلے نے ایجاد کیا اور اس کے دو ساتھیوں نے اسے ترقی دے کر ہر لحاظ سے مکمل کر دیا۔ ٹرانسیسٹر نے ریڈیوں کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

ٹرانسیسٹر کے بعد ٹیلی ویژن کی ایجاد عمل میں آئی ٹیلی ویژن دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ''ٹیلی'' (TELE) اور ''ویژن'' (VISION) ٹیلی ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بہت دور سے اور ویژن لاطینی لفظ ہے۔ جو وَرَب TO SEE سے بنا ہے، اور جس کے معنی دیکھنا یا دکھائی دینا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے معنی ہوتے بہت دور کی چیز کو دیکھ لینا۔

ٹیلی ویژن کی ایجاد سے قبل ریڈیو ابلاغ کی دنیا کی حقیقت بن چکا تھا۔ خاموش متحرک فلموں کو پردے پر پیش کرنے میں بھی کامیابی مل چکی تھی۔ پھر جلد ہی سائنس دانوں نے تصویر کی حرکت کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کرنے کے طریقے ڈھونڈ

لیے۔ لیکن انھیں کسی مخصوص جگہ ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ یعنی پروجیکٹ کیا جاتا تھا ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹیلی ویژن نے اس محدودیت کو توڑا یہ صوت وعکس کا خوبصورت امتزاج لیے ہر وقت آپ کے بیڈ روم سے ڈرائنگ روم تک حاضر ہے۔ آپ بس کار یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں یہ کسی ہمدم دیرینہ کی طرح ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔

ان تمام ایجادات کے ساتھ آج عوامی ابلاغ سماج کے بنیادی ڈھانچے میں اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح انسانی شریانوں میں خون۔ آج عوامی ابلاغ ہماری ہر سرگرمی میں سرایت کر چکا ہے۔ لہذا زندگی سے نہ الگ ہوا ہے اور نہ کبھی الگ ہوگا۔ یہ زندگی کے ہر لمحے کو اپنی گرفت میں رکھے ہوئے ہے اور ہر لمحہ ہماری سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آج اس کے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ کیوں کہ یہ ہماری روزمرہ کی عادت بن گیا ہے۔

آج ان کے توسط سے کسی مسئلے کی تفسیر وتفصیل پیش کی جاتی ہے۔ اس سے رائے عامہ ہموار کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ مستقبل کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے راستے بھی ہموار کرتے ہیں۔ یہ ہمیں باخبر کر کے نئی فکر نئے شعور سے ہم آہنگ ہی نہیں کراتے، نئے مسائل کے روبرو ہی نہیں لاتے، بلکہ تجربات میں وسعت پیدا کر کے نئے نئے چیلنجز قبول کرنے کے لائق بھی بناتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ تر دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ آج دنیا کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی میں عوامی ذرائع سب سے اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کی مناسب شیرازہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہمارے معاشرے پر کچھ منفی اثرات بھی ڈال رہے ہیں۔ جس سے ہماری تہذیبی میراث، اقدار، فکر اور رجحانات کے صحت مند عناصر منتشر ہو رہے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعے تجارتی مزاج کی جو پرورش وپرداخت ہو رہی ہے اس سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ امیری اور غریبی کے درمیان کا فاصلہ کم ہو۔

مختصر یہ کہ عوامی ذرائع ابلاغ جس پر انسان کی روزمرہ زندگی کا انحصار ہو گیا ہے۔ جو ہمارے تہذیبی عوامل کو، ہمارے فکری میلانات کو، ہماری بلند اقدار کو اور ہمارے مادی وسائل کو شدت سے متاثر کر رہے ہیں جو ہماری زندگی پر مثبت اور منفی دونوں اثرات ڈال رہے ہیں اور جو ایک مضمون کی حیثیت سے دوسری زبانوں میں فروغ پا رہے ہیں اس پر اردو میں اتنا کم لکھا گیا ہے جو بلا مبالغہ نہیں کے برابر ہے۔ جب کہ اردو زبان عوام کی زبان ہے میڈیا کی زبان ہے، ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن میں نیوز ہو، ڈاکومنٹری ہو یا فکشن اردو کا جادو ہر جگہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اردو تلفظ، اردو الفاظ، اردو مکالمے اور اردو گانے میڈیا کے پروگراموں کا معیار متعین کرتے ہیں۔ پھر بھی اردو میں اس موضوع پر نہ تو اچھی کتابیں ہیں نہ سمینار ہوتے ہیں نہ مذاکرے۔

اسی طرح پورے ہندوستان میں ایک بھی ایسا ادارہ نہیں جو اردو کے ذریعے ماس کمیونیکیشن کی باقاعدہ تعلیم دیتا ہو۔ کچھ جامعات میں جز وقتی ڈپلوما ہوتا ہے کچھ جامعات کے شعبہ اردو نے ایم اے اور بی اے میں کچھ اختیاری پیپر رکھے ہیں۔ جب کہ یورپ اور امریکہ کی اکثر یونیورسٹیوں میں ماس کمیونیکیشن کا الگ شعبہ ہوتا ہے جس میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے خود ہمارے ملک میں بھی بہت سی یونیورسٹیوں اور اداروں میں ماس کمیونیکیشن کی اعلیٰ تعلیم انگریزی یا ہندی کے ذریعے دی جارہی ہے۔ مگر نہیں دی جارہی ہے تو اردو میں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ماس کمیونیکیشن جب جغرافیہ ،تاریخ اور عمرانیات کی طرح ہی ایک مضمون ہے تو اسے بھی انگریزی کے توسط سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اردو ہی کے ذریعے اسے پڑھنا کیا ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی علم کو مادری زبان میں ہی سب سے بہتر طریقے سے سیکھا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو کے طالب علموں یا اردو جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو انگریزی اتنی اچھی نہیں جانتی کہ اس کے ذریعے سے کسی مضمون کا مطالعہ کر سکے۔ مزید یہ کہ اگر اس مضمون کو اردو میں فروغ دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس میں ایک نئے علم کا اضافہ ہوگا بلکہ اس کے ذریعہ نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئی اصطلاحات بھی اردو میں شامل ہوں گی۔ جس سے

زبان میں وسعت پیدا ہوگی اور لوگوں کی اردو میں دلچسپی بڑھے گی۔

یہ باتیں کافی دنوں سے ذہن میں تھیں چنانچہ اردو اکادمی دہلی کے اراکین نے مجھے ایک سیمینار کرانے کی پیش کش کی تو میں نے فوراً اس موضوع کا انتخاب کیا اس کی تفصیلات تیار کیں اور 4-5 مارچ 2004 کو سیمینار منعقد ہوا۔ افتتاحیہ کے علاوہ سیمینار کے تین اجلاس رکھے گئے تھے۔ جس میں پہلے اجلاس کا موضوع ''عوامی ذرائع ابلاغ سمت ورفتار'' تھا۔ دوسرا اجلاس ''اردو صحافت ایک ہمہ گیر ذریعہ ابلاغ'' پر محیط تھا۔ تیسرے اجلاس میں ''ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما'' کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یہاں مقالوں کو مرتب کرتے وقت بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اب سیمینار کے مقالے کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کے معیار کا تعین کرتے وقت آپ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ دہلی میں اردو میں یہ اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے پہلی کوشش ہے۔

بہرحال میں اکادمی کے سابق نائب صدر م. افضل صاحب کا اور سکریٹری مرغوب حیدر عابدی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس موضوع پر سیمینار کرانے کا موقعہ مجھے فراہم کرایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اکادمی کے دوسرے اراکین کا بھی بے حد شکر گذار ہوں کہ ان کے ماہرانہ عملی تعاون کے بغیر اس سیمینار کا خوش اسلوبی سے منعقد ہونا مشکل تھا۔ میں ان ادیبوں اور دانشوروں کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں جو دور دراز علاقوں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے یہاں آئے اور اپنے مقالے پیش کیے۔ ساتھ ہی ان سامعین کا بھی شکریہ جنھوں نے اس سیمینار میں شریک ہوکر اسے کامیاب بنایا۔ میں اکادمی کے موجودہ وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس کا بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں اپنا مکمل تعاون عنایت فرمایا۔

پروفیسر محمد شاہد حسین
ہندستانی زبانوں کا مرکز
جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی-67

پیش گفتار

اردو اکادمی دہلی اپنے قیام سے اب تک، پچیس سالہ عرصہ میں مختلف موضوعات پر سمینار کرتی رہی ہے۔ جس میں دہلی، ہندوستان اور بیرونِ ملک سے دانشور حضرات شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان اجتماعات میں مضامین اور مقالات پڑھے جاتے ہیں اور بحث ومباحثہ بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات ایک علمی سرمایہ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس سرمائے کو محفوظ کرکے آئندہ نسلوں تک پہنچانا صرف اردو کی خدمت ہی نہیں بلکہ اردو والوں کا فرض اولین ہے۔ اردو اکادمی دہلی اس فرض کو بہ حسن خوبی انجام دے رہی ہے۔

زیرنظر کتاب ایسے ہی سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ سمینار بعنوان — اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ — منعقد ہوا تھا۔

ابلاغ یعنی — ترسیل، پہنچانا، بھیجنا، تبلیغ اور اشاعت۔

آج جبکہ اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی ترقی نے ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں بدل دیا ہے۔ میڈیا، خبروں کی ترسیل میں بھی تیزی آگئی ہے۔ جس طرح کوئی خبر ایک چھوٹے سے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک معمولی خبر انٹرنیٹ، سٹیلائیٹ، ٹیلی ویژن، فلم، ای میل اور موبائیل فون کے ذریعہ دنیا بھر میں پہنچ جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی جدید سہولتیں اردو کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی کہ

بھی زبان کے لیے ہوسکتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو داں طبقہ اردو میں کوئی خبر یا اطلاع جو ایک عرصہ میں پاتا تھا اب منٹوں سیکنڈوں میں فراہم کرلیتا ہے۔

بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ الکٹرانک میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن پرنٹ میڈیا کی اہمیت الگ اور اپنی جگہ مستحکم ہے۔ یہ قدیم ذریعہ ابلاغ ہے جس سے خبریں، اطلاعات اور پیغامات ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتی تھیں۔

اخبار کا چلن صدیوں پہلے لندن سے شروع ہوا۔ جب کچھ افراد نے دن بھر کی خبریں یا روداد چٹپٹی کہانیاں بنا کر لکھنا شروع کیں۔ ان میں خبر کم اور حاشیہ آرائی یا جھوٹ زیادہ ہوتا تھا تاکہ عوام اسے چٹخارے لے کر پڑھیں۔ یہ خبریں پرکشش زرد کاغذ پر لکھی جاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ حاشیہ آرائی ختم ہوتی گئی اور اس کی کوکھ سے معیاری صحافت نے جنم لیا۔ لیکن جھوٹی یا چٹپٹی خبروں کو زرد صحافت (Yellow Journalism) کا نام دیا گیا۔ جس کا استعمال غیر معیاری صحافت کے لیے ہر زبان میں آج بھی ہوتا ہے۔

انگریزی اخبار کے چلن سے صدیوں پہلے ہندستان میں اخبار نویسی رائج تھی۔ عربی فارسی میں اخبار لکھے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ اخبار عوامی نہیں تھے لیکن ان کا اپنا وجود تھا۔ یہ خبریں ملک کے مختلف حصوں سے حکمراں یا بادشاہ کو روانہ کی جاتی تھیں۔ مولوی محمد حسین نے ابن بطوطہ کے سفرنامے کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے یہ سفر آٹھویں ہجری یا مسیحی کی چودھویں صدی میں کیا تھا۔ خبروں کی ترسیل کو ابن بطوطہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

> ”سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا۔ جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں۔ وہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعہ پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کو اس ملک میں برید کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں

ہی۔ گھوڑوں کی ڈاک کو اولاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلتا
ہے۔ یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے ہیں۔ پیدلوں کی ڈاک کا یہ
انتظام ہے کہ ایک میل میں جس کو وہ کروہ کہتے ہیں، تین چوکیاں
ہرکاروں کی ہوتی ہیں۔ اس چوکی کو داوہ کہتے ہیں۔ ہر ایک تہائی میل کے
فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لیے
برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے
ہیں۔ ہر ہرکارے کے پاس ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی ہے۔ جس کے
سرے پر تانبے کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی
ہے تو وہ ایک ہاتھ پر لفافہ رکھ لیتا اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور تمام
طاقت خرچ کر کے دوڑتا ہے۔ دوسرا ہرکارہ اس کے گھنگھروؤں کی آواز
سن کر تیار ہو بیٹھتا ہے اور لفافہ لے کر فوراً دوڑ پڑتا ہے۔ اس طرح
جہاں کہیں خط پہنچانا ہوتا ہے پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک
سے بھی جلدی جاتی ہے۔'' (ماخوذ سفرنامہ ابن بطوطہ،ص 34)

اردو میں اخبار نویسی کا سلسلہ 29 ستمبر 1842 سے شروع ہوا جب کلکتہ سے پہلا اخبار — 'جام جہاں نما' شائع ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ تک پہنچتے پہنچتے بہت سے اخبار منظر عام پر آئے جن میں دہلی اردو اخبار، سید الاخبار، مظہر حق، صدالاخبار، فوائد الشائقین، قران السعدین، عمدۃ الاخبار، مطلع الاخبار، اودھ پنچ شامل ہیں۔ اردو اخبارات نے جدوجہد آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ جس نے حکومت برطانیہ کی نیندیں اڑا دیں۔ آزادی، انقلاب زندہ باد، اور شہید جیسے الفاظ نے اردو صحافت کے ذریعہ عوام میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اس سمینار کا مقصد اس بات پر روشنی ڈالنا تھی کہ ذرائع ابلاغ سے اردو کا فروغ کیسے اور کس طرح ہوا اور اردو سے ذرائع ابلاغ کو کیا فوائد ہوئے ان کا رشتہ آپس میں کتنا مستحکم ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالوں میں اس موضوع اور اس کی

معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے ساتھ اردو کے رشتوں کا تذکرہ تکنیکی اور علمی طور پر کیا گیا ہے۔ سمینار کے انعقاد اور کامیابی میں پروفیسر محمد شاہد حسین اور جناب مرغوب حید ر عابدی، سکریٹری اردو اکادمی کی کوششیں شامل رہی ہیں۔ میں ان حضرات کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے بھی اس سمینار کی ذمہ داری سونپی اور سمینار کے کنوینر کے طور پر شامل کیا۔

اظہار عثمانی

ڈاکٹر قیصر شمیم

ذرائع ابلاغ کی ابتداء وارتقاء

موضوع دیا گیا: ''ذرائع ابلاغ کی ابتداء اور ارتقاء'' دوسو سال پر محیط ارتقاء کی تاریخ اور پندرہ منٹ کی پابندی— خدا خیر کرے۔ نجات کی صورت یہی ہے کہ تاریخ کی کھتونی کے بجائے جھلکیاں پیش کی جائیں اور تفصیل جو کتابوں اور رسالوں میں موجود ہے یا ہمارے حافظہ کا حصہ ہے اس سے گریز کرکے محض اشاروں کنایوں سے کام لیا جائے۔ البتہ اصطلاحات کے سلسلہ میں جو غلط مبحث ہے اس کی تفصیل ضروری ہے تاکہ ترسیل عامہ کی تعریف متعین ہو اور اسے ترسیل کی قدیم صورتوں سے ممیّز کرکے ہندستانی سماج میں اس کی ابتداء کا تعین کیا جاسکے۔

اردو میں لفظ ''ترسیل'' خیالات ، اطلاعات اور تجربات کو دوسروں تک پہنچانے یا دوسروں کو ان میں شریک کرنے کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ جب کہ بلیغ ، بلاغت اور ابلاغ ذرا مختلف معنوں میں مستعمل تھا۔ لیکن اب ہندستان میں بھی ذرائع

ترسیل کے لئے ذرائع ابلاغ کا استعمال ہونے لگا ہے۔اسی طرح جیسے خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ کہنے کا رواج ہورہا ہے۔ البتہ ہندستان کو بھارت کہنے اور لفظ ہندستان سے قصداً گریز کرنے کی ادا ہم نے ابھی تک نہیں اپنائی ہے۔ الفاظ کا چلن اپنے اندر سیاسی مضمرات بھی رکھتا ہے اور جسے ہم زبان کی تخلیقیت کا عمل کہتے ہیں وہ بھی سیاست سے خالی نہیں ہوتا ہے؛ بالکل اسی طرح جس طرح عربی مصطلحات کو اپنانے کی وکالت کے پس پشت بلاد اسلامیہ سے جڑنے کی خواہش اور پان اسلام ازم کے دل خوش کن تصورات کارفرما تھے۔

الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب رواج پا جائیں تو فصاحت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہیں۔ پھر بھی مشتقات کی سہولت کے لیے ہم فی الحال ترسیل، ترسیل عامہ اور ذرائع ترسیل عامہ کے استعمال پر قائم ہیں۔

آخر وہ کون سی چیز ہے جو ترسیل عامہ کو ترسیل کی دیگر صورتوں سے جدا کرتی ہے۔ مشاعرہ، مجلس، قوالی کا رواج تو بہت پرانا ہے۔عوام سے خطاب کرنے کی بہت سی صورتیں تھیں۔فرامین بھی جاری ہوتے تھے اور قلمی اخبارات بھی نکلتے تھے۔ پھر ہندستانی سماج میں ترسیل عامہ کا آغاز کب ہوا؟ کیا اس کا تعلق مشین کے استعمال سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو ٹیلی گراف، پوسٹ کارڈ، SMS اور ٹیلی فون کے ذریعہ ترسیل کو بھی ترسیل عامہ کی تعریف کے تحت لایا جانا چاہیے اور ہندستانی سماج میں جب سے مشین کا استعمال ،ترسیل کے ذریعہ کے طور پر ہوا اسے ترسیل عامہ کی ابتداء مان لینا چاہئے۔

اصطلاحات، خیالات وتصورات پر دلالت کرتی ہیں۔اس لیے لازم ہے کہ ہم ان خیالات وتصورات کو سمجھنے کی کوشش کریں جو ترسیل عامہ کے عمل میں کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً: لفظ ماس (Mass) ہم آئے دن سنتے ہیں۔ جب اشیا کی پیداوار بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے تو ہم اسے ماس پروڈکشن کا نام دیتے ہیں؛ عام لوگوں کی تہذیب کو ماس کلچر اور عوام کی بڑے پیمانے پر خواندگی کو ماس لٹریسی کہا جاتا ہے۔ ان سب میں بہت بڑے پیمانے، عظیم الجثہ یا عوام کی بہت بڑی تعداد کا تصور

پنہاں ہے۔ یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر یہ ماس ہے تو پھر پبلک کیا ہے؟

پبلک بنام ماس: جب سماج بدلتا ہے تو سماج میں مروج تصورات بھی بدلتے ہیں اور الفاظ و اصطلاحات نئے روپ بھرتے ہیں مثلاً: پرانے زمانہ میں جب ہم شہر کہتے تھے تو اس سے دیہات کے برعکس ایک ایسی جگہ مراد لیتے تھے جہاں زراعت کے بجائے تجارت کی منڈیاں ہوتی تھیں یا جہاں سے حکومت کا کام کاج ہوتا تھا یا جہاں تہذیبی سرگرمیوں کی جلوہ گری ہوتی تھی۔ جس طرح کے صنعتی شہر آج موجود ہیں پہلے ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لیے اب قصبہ، شہر، نگر، مہانگر، میٹرو پولس اور میگا سیٹی جیسی اصطلاحات رواج پا رہی ہیں۔ اسی طرح صنعتی سماج میں عوام کی اتنی بڑی تعداد کو ظاہر کرنے کے لئے ماس کی اصطلاح مستعمل ہے اور اتنے مخاطبین کی اتنی بڑی تعداد تک پیغام کی ترسیل کو ترسیل عامہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کتنی بڑی تعداد کو ہم پبلک کے بجائے ماس گردانیں؟

سماجیات کے ماہرین کی رائے میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد جو کسی جگہ جمع ہو سکے اور جس سے براہ راست تخاطب ممکن ہو عوام بمعنی پبلک گردانی جائے گی۔ اس کے برعکس اتنی بڑی تعداد جس کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہ ہو اور جس سے براہ راست شخصی ترسیل ممکن نہیں ہو ماس قرار دی جائے گی۔ مثلاً کسی عوامی جلسہ، مجلس یا قوالی کے سامعین تو عوام بمعنی ''پبلک'' کہلائیں گے۔ لیکن ریڈیو کے سامعین، اخبار کے قاری اور فلم کے ناظر ''ماس'' کے زمرہ میں آئیں گے اور ان کے درمیان ہونے والا بالواسطہ ترسیل کا عمل، ترسیل عامہ کہلائے گا جس کا ذریعہ یا میڈیم ریڈیو، پریس یا فلم ہے جس کی وجہ سے ہم ان کو ذرائع ترسیل عامہ Mass Communication Media کا نام دیتے ہیں۔

پبلک اور ماس میں وجہ امتیاز اور بھی ہے۔ پبلک کے مقابلہ میں ماس یعنی مخاطبین کی اتنی بڑی تعداد، اپنے مزاج کے اعتبار سے متنوع یعنی Hetrogeneous ہوگی اور ایک دوسرے سے بیگانہ یعنی Anonymous بھی؛ جب

کہ عوامی جلسہ، مجلس یا قوالی کا سامع اپنے مرسل کے سامنے موجود ہے۔ اسے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے۔ مرسل بھی براہ راست بازرسی یعنی فیڈ بیک کے ذریعہ سامعین یعنی مرسل الیہ کے ردعمل کا اندازہ لگا کر اپنے بیان میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ بالواسطہ ترسیل میں یہ ممکن نہیں۔ بازرسی یا فیڈ بیک نہ صرف انتہائی محدود اور دیرپا ہے بلکہ کسی اور ایجنسی کے تابع ہے۔ یہ پبلک کی طرح مشترکہ ردعمل پیش کرنے پر بھی قادر نہیں ہوتے کیونکہ ایک دوسرے سے بیگانہ محض ہوتے ہیں۔ ترسیل عامہ کی اور بھی امتیازی خصوصیات ہیں جن پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں۔

جس طرح ترسیل عامہ کو محض مشین یا جدید ذرائع Modern Media کے استعمال کا مترادف نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس طرح خود ذرائع یعنی میڈیا سے مشین یا اس کی پیداوار مراد نہیں لینا چاہیے۔ جب ہم پریس کو ترسیل عامہ کے ذرائع میں ایک قرار دیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد طباعت کا وہ عمل ہے جس میں ترسیل، مطبوعہ صفحات کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی کتاب، اخبارات اور رسائل پریس کی پیداوار ہیں نہ کہ بذات خود ذریعہ۔ یہی بات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ ہندستانی سماج میں ترسیل کے اس غیر شخصی اور بیشتر حالات میں یک طرفہ عمل کی ابتدا کب ہوئی اور یہ ارتقاء کے کن مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ متذکرہ تعریف کی روشنی میں اس کی ابتداء یقیناً پریس کی آمد سے مانی جائے گی۔ پریس کی آمد، ہندستانی سماج میں مشین کی آمد بھی تھی جس نے دستی نقل نویسی کے مقابلہ میں مشینی نقل تیار کر کے نئے رشتوں کی بنا ڈالی؛ لیکن یہ تبدیلی ایک دو یا چند مشینوں کی آمد سے رونما نہیں ہوئی بلکہ دیگر سماجی تبدیلیوں کے ساتھ رونما ہوئی اور سماجی تبدیلی کی محرک قوتوں کی معاون بنی۔ اس لیے اس تبدیلی کا ابتدائی نقش 1556 میں چھاپا خانہ کی پہلی مشین کی آمد کے بجائے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا واقعہ، 1780 میں پہلے مطبوعہ اخبار ہکیز بنگال

گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈ ورٹائزر کا شائع ہونا ہے۔ قلمی اخبارات کی طرح یہ نہ تو کسی حکمراں کی خفیہ خبر رساں کا ذریعہ تھا اور نہ ہی اس کی حیثیت سرکاری گزٹ یا نیوز لیٹر کی تھی۔ یہ فرد کے اظہار رائے کا ذریعہ تھا جس کے مخاطب ، محدود معنوں میں سہی، عام لوگ تھے۔ قلمی اخبارات کی طرح نہ تو اس کی ابتداء ''دائرہ دولت بندگان حضرت ظلِ سبحانی'' کی نجی مصروفیات سے ہوتی تھی اور نہ ہی دیگر خبروں کی ترتیب میں حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ ایک ''سیاسی وتجارتی اخبار'' تھا جس میں مرتبہ اور عہدے کی نہیں، خبروں اور اشتہارات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ہکی اس ٹیب لش منٹ کا باغی تھا اور کمپنی کے خلاف برطانوی رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یعنی یہ جدید معنوں میں اخبار تھا اور اس سے ہندستان میں اس صحافت کی ابتدا ہوئی جو آج جمہوریت کا ایک اہم ستون ہے۔

ہندستان میں جن لوگوں نے انگریزی صحافت کی ابتداء کی ، اور جس کے بطن سے اردو اور دیگر ہندستانی زبانوں کی صحافت نے جنم لیا، وہ یورپ کے پروردہ تھے۔ انگلستان میں اگرچہ اخبارات کی آزادی کے حق کو 1641 میں تسلیم کرلیا گیا تھا مگر جس واقعہ نے اس معاملہ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا وہ 1789 میں رونما ہونے والا فرانسیسی انقلاب ہے جس نے انسان کو شخصی آزادی اور مساوات کے قانونی حق سے سرفراز کیا۔ 1791 میں فرانس کی قومی اسمبلی نے جو جمہوری دستور مرتب کیا اس کی گیارہویں دفعہ کے مطابق فرانس کے شہریوں کو تحریر وتقریر کے ساتھ، اخبار نویسی کی بھی قانونی آزادی دی گئی۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں تاریخ کی یہ بہت بڑی جست تھی جس نے آنے والے زمانے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جدید صحافت بھی انھیں تبدیلیوں کے بطن سے پیدا ہوئی۔

ہندستان میں جب جدید صحافت کی ابتداء ہوئی تو اس کے پس پشت نہ صرف فرانسیسی انقلاب کی روایات تھیں بلکہ خود انگلستان میں سیاسی انقلاب آچکا تھا اور بادشاہ کے مقابلہ میں پارلیمنٹ کی برتری کو تسلیم کیا جاچکا تھا۔ ان سب کے نتیجہ میں وہاں لبرل

خیالات کی ایک لہر سی چل پڑی تھی۔ لیکن ہندستان ایک نوآبادی تھی جہاں براہ راست تا ج برطانیہ کے بجائے وہاں کی ایک تجارتی کمپنی کی حکومت تھی۔ اس لیے یہاں تحریر وتقریر کی وہ آزادی نہیں تھی جس کے وہ جویا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں صحافت کی ابتدائی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ اظہار رائے کی آزادی اوراختلاف کے حق کے حصول کے لیے جہد وجہد اور قربانیوں سے عبارت ہے۔ باخبر ہونے اور دوسروں کو باخبر بنانے کا جو حق پریس کو حاصل ہے وہ ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کی تاریخ سے آپ سب واقف ہیں۔

مطبوعہ صفحہ فرد کی آزادی کا اعلان تھا۔ یہ ہندستانی سماج میں جس تبدیلی کا نقیب تھا وہ کئی اور تبدیلیوں کے جلو میں نمودار ہوئی۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ 15 ؍جنوری 1784 کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام تھا۔ یہ اس ملک میں جدید طرز کی پہلی علمی و تحقیقی سوسائٹی تھی جس نے قدیم علمی، تاریخی ذخیروں کی تلاش وتحقیق کا کام مغربی اصولوں کے مطابق کیا اور منظم طریقے پر مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرایا۔ لیکن اس مجلس میں اس کا ذکر اس لیے کیا جارہا ہے کہ یہ ہندستانی سماج میں قائم ہونے والی پہلی رضا کار تنظیم تھی؛ یعنی اس سے ہندستان میں انجمن سازی کی ابتداء ہوئی ہے۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ ڈاک کی سہولت کو عام آدمی کو دستیاب کرانا تھا۔ خبررسانی کی قدیم صورتوں کی طرح ڈاک کا قدیم نظام بھی عام آدمیوں کی دسترس سے باہر تھا۔ کمپنی کے نئے انتظام کے تحت، ڈاک کا محکمہ 1766 میں قائم ہوا تھا۔ 1780 میں جب پہلا مطبوعہ اخبار شائع ہوا تو یہ نظام اتنا پختہ ضرور تھا کہ کلکتہ اور اس کے مضافات میں اخبار ڈاک کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ مدراس اور ممبئ میں بھی جیسے ہی اخبارات شائع ہونے لگے ان کو یہ سہولت دستیاب ہوگئی۔ 1789 تک کلکتہ سے مچھلی پٹنم، پونا ہوتے ہوئے ممبئ تک ڈاک کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور اسے نجی خطوط کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ 1795 تک بنگال، بہار، اڑیسہ، الہ آباد، آگرہ اور دہلی کے درمیان ڈاک کا یہ نیا نظام قائم ہوگیا تھا۔ 1854 میں ڈاک ٹکٹ کے اجراء کے

ساتھ، ملک میں کسی بھی فاصلہ پر ڈاک بھیجنے کے لیے یکساں محصول کے ساتھ ہی یہ نظام پوری طرح جدید دور میں داخل ہوگیا۔ اس سے قبل فاصلہ کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا مگر اب یہ ممکن ہوگیا کہ وزن کے مطابق ٹکٹ چپکا کر ملک میں کہیں بھی ڈاک بھیجی جاسکتی تھی۔ بعد میں ٹیلی گراف اور ریلوے کے فروغ نے اس عمل کو اور بھی استحکام بخشا۔

میڈیا کا ارتقاء محض تاریخ کی کھتونی نہیں ہے کہ ریڈیو کب شروع ہوا، پہلی فلم کب بنی، ٹیلی ویژن نے کب اپنا جلوہ دکھایا اور یہ سب ذرائع کس طرح ہمارے سماج میں بڑھتے پھیلتے رہے۔ یہ سب بار بار لکھا جاچکا ہے اور کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس علمی مجلس میں ہمارے لیے اہم یہ ہے کہ ابتداء میں میڈیا کی جو اٹھان تھی اس نے آگے چل کر کیا رنگ روپ اختیار کیا اور اکیسویں صدی میں اس کا کردار کیا ہے۔

اس کا مختصر ترین جواب تو یہ ہے کہ پریس کا فروغ جن تبدیلیوں کے جلو میں ہورہا تھا ان کی حیثیت ایک سیلاب رواں کی تھی جس سے ذہنی بیداری کی لہریں اٹھتی رہیں۔ کتابوں، رسالوں اور اخبارات نے شعروادب، صحافت اور علوم کا دروازہ عام آدمیوں کے لیے کھول دیا۔ تبدیلی کی ان محرک قوتوں پر قدغن لگانے کی حکومت کی ساری کوششیں ناکام ہوتی رہیں اور بالآخر اظہار رائے کی آزادی کی یہ جدوجہد، جنگ آزادی کے دوران ایک خونچکاں داستان رقم کرگئی۔ جسے آپ پریس کی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے اتنے کم وقت میں مناسب یہی ہے کہ باخبر ہونے اور باخبر کرنے کے حق کو آج جو خطرہ درپیش ہے اس پر توجہ کی جائے؛ یعنی وہ خطرہ جو کھلی معیشت، آزاد منڈی اور اطلاعات کے آزادانہ بہاؤ نے پیدا کیا ہے۔ پرانے زمانے میں شاہراہیں سلطنت کی گرفت مضبوط رکھنے میں معاون ہوتی تھیں۔ نئے زمانے میں ترسیل کی شاہراہیں، ترقی یافتہ ممالک کی بالادستی کو مستحکم بناتی ہیں۔ یہ نئے زمانے کی سامراجیت ہے مگر مقصد وہی معاشی استحصال ہے۔

اطلاعات کا آزادانہ بہاؤ گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے زیر بحث رہا

ہے۔ اس کی نت نئی تعبیرات پیش کی جاتی رہی ہیں اور اسے باخبر ہونے کے حق کا لازمی جزو قرار دیا جاتا ہے۔ بادہ النظر میں یہ بات جتنی سادہ معلوم ہوتی ہے درحقیقت اتنی سادہ نہیں ہے۔ ابتدا میں ان مباحث سے ایسا گمان ہوتا تھا کہ آزاد معیشت اور آزاد تجارت جیسی کوئی چیز نہیں لیکن گذشتہ دس سال میں ہندستان کے تجربات کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔ عالمی سطح پر خبروں کی ترسیل اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے افراد اور اقوام کے باہمی ترسیل نظام پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ جو عالمی ترسیل اور اطلاعاتی نظام تشکیل پا رہا ہے۔ اس کا استعمال محض میڈیا تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ معیشت کے سارے شعبوں پر محیط ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑا مسئلہ سرحد کے پار اعداد وشمار کی بلا روک ٹوک ترسیل ہے۔ کثیر قومی کمپنیاں، عالمی پیمانہ پر اشیاء کی پیداوار اور اس کی تقسیم کے لیے اور بازار کو کنٹرول کرنے کے لیے، اس نظام سے حاصل اعداد وشمار کا جس طرح استعمال کرتی ہیں وہ پسماندہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اعداد وشمار کو حاصل کرنے، ان کو محفوظ رکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی ٹکنالوجیکل برتری کی بنیاد پر، برق رفتاری سے ایسے فیصلے کرسکتی ہیں جو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع کا باعث ہو اس برتری سے جہاں کثیر قومی کمپنیوں کی ترقی ہو رہی ہے وہیں اس سے پسماندہ ممالک میں معیشت اور تمدن ہی نہیں خود سلامتی کے بھی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

تشویش کی ایک اور بات ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں جب اطلاعات کے آزادانہ بہاؤ کے خلاف بحث چھڑی تو ناوابستہ ممالک کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ نامیڈیا NAMEDIA اس تحریک کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ اطلاعات اور ترسیل کی عالمی سطح پر تنظیم نو کی مانگ، اس جدوجہد کا حصہ تھی جو غیر ترقی یافتہ، نو آزاد ممالک، ترقی یافتہ ممالک کی بالادستی کے خلاف کر رہے تھے مزید برآں یہ خوف کہ کمپیوٹر اور ترسیلی قوت سے مسلح، کثیر قومی کمپنیاں، دوسروں کو معاشی، سیاسی اور ثقافتی طور پر دبوچ لیں گی محض ان غیر ترقی یافتہ ممالک تک محدود نہیں تھا جنھوں نے

نئے عالمی اطلاعاتی اور ترسیلی تنظیم NWICO کے لیے تحریک چلائی تھی بلکہ اس زمانے میں مغرب کے بہت ترقی یافتہ ممالک بھی اس خوف میں مبتلا تھے کہ زیادہ بڑی مچھلی، نسبتاً چھوٹی مچھلی کو کھا جائے گی۔ کنیڈا بہت دنوں تک اطلاعاتی ٹکنالوجی کے پیش رفت سے پیدا ہونے والے معاشی اثرات کا شاکی رہا تھا۔ فرانس نے ثقافتی سامراجیت کی شکایت کی تھی۔ سویڈن نے بار بار اس قسم کے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح NWICO کو عالمی حمایت حاصل ہوسکی تھی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر 1976 میں نیروبی میں ہونے والی یونیسکو کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں یونیسکو کو ہدایت دی گئی کہ وہ ترسیل کے مطالعہ کے لیے ایک کمیشن مقرر کرے۔ نتیجہ میں ایک سولہ رکنی کمیشن کو یہ کام سونپا گیا جس کے سربراہ آئرش وکیل، صحافی، سیاست داں، نوبل انعام یافتہ اور لینن انعام یافتہ سین میک برائڈ تھے۔ اس کمیشن نے 1979 میں اپنی رپورٹ تیار کی جو اس قرارداد کی بنیاد بنی جسے 1980 میں بلغراد میں ہونے والے یونیسکو کے اکیسویں جنرل کانفرنس میں منظور کیا گیا اور جو نئے اطلاعاتی نظام کی جدوجہد کا ایک روشن باب ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دنیا یک قطبی ہوگئی۔ اب خود اقوام متحدہ کا وجود خطرہ میں ہے۔ ناوابستہ ممالک کی تحریک بدلے ہوئے حالات میں اپنے استعماریت مخالف کردار کو متعین کرنے میں ناکام رہی ہے۔ NWICO پر گفتگو تقریباً ختم ہوچکی ہے اور ناوابستہ ممالک کے عوام، ادیب، صحافی اور دانشور انگشت بدنداں ہیں ؎

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

اسلم فرشوری

برقیاتی ذرائع ابلاغ کے سماجی اثرات ...اور اردو

ابلاغ عامہ اور ذرائع ابلاغ ایک وسیع رواں موضوع ہے۔ روز بہ روز سال بہ سال ابلاغی ٹکنالوجی کی تبدیلیاں، ابلاغی حکمت عملی کے سماجی اثرات، نشریاتی یلغار کے پیدا کردہ مسائل یہ وہ امور ہیں جن پر مسلسل لکھنے، سوچنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی ضرورت درپیش ہے۔ ذرائع ابلاغ کو جن میں ریڈیو، ٹی وی، فلم، انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں اس لحاظ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ نہ صرف افراد کی ذہنی نشوونما، سیاسی بصیرت، سماجی شعور کی بیداری اور کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں بلکہ رائے عامہ کی تشکیل میں بھی ہمیشہ سے بنیادی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ یہ دور درحقیقت ذرائع ابلاغ کا ہی دور ہے اور آج ہر میدان میں انھیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

''ابلاغ'' مطبوعاتی ہو یا نشریاتی دونوں کی افادیت اور اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ابلاغ سیکھنے کے عمل کا ضروری اور اہم ترین وسیلہ بھی ہے اور ایک طرح سے گویا یہ تعلیم عامہ کی اولین شرط ہے۔ اس طرح ابلاغ عامہ کے ذرائع

ہی وہ وسیلہ ہیں جن کے ذریعے ہم عصر معاشرہ اپنے تصورات اور مقصد کی جانب اپنے راستے نکالتا ہے۔ انھیں بدلتا اور منزل کا تعین کرتا ہے۔

ایک معاشرتی ادارے کے طور پر جہاں ایک طرف ذرائع ابلاغ تعلیم عامہ کا وسیلہ ہیں تو دوسری جانب یہی ذرائع عامہ عوام میں وسیع طور پر گمراہی اور غلط بیانی کے امکانات کو بھی فروغ دینے میں منفی رول ادا کرتے ہیں۔ یعنی وقت واحد میں ان سے سچائی اور جھوٹ دونوں کی اشاعت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس بات کو اگر میں یوں کہوں کہ ذرائع ابلاغ معاشرے میں تبدیلی کا یقینی امکان تو مہیا کرتے ہیں تاہم یہ تبدیلی اچھی یا بری ہر دو طرح کی ہوسکتی ہے۔ پچھلے دو دہوں کا اگر ہم تنقیدی جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ یہ صرف ذرائع ابلاغ ہی ہیں جنھوں نے ان برسوں میں انسانی زندگی پر اپنے اثرات میں کئی چند اضافہ کیا ہے اور اب ابلاغ عامہ ایسی قوت ہے کہ جس کا اثر آج کی دنیا پر لامحدود اور بے حساب ہے۔ ایک ایسے عہد میں، جب پیغامات اور تصاویر چند ثانیوں کے اندر اندر سیاراتی مواصلت سے خلا میں ۳۰ ہزار میل دور بھیج کر اپنی زمینی منزل تک لوٹا دی جاتی ہوں تو ذرائع ابلاغ پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کے ساتھ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت پاچکے ہیں۔ چوں کہ ابلاغ عامہ کے عمل نے ہمارے ذہن و دل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی ہے اس لیے کہ بین الافرادی ابلاغ گھٹ گیا ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ جس کی وجہ سے مدرسہ اور گھر دونوں مقامات پر نوعمروں میں سماجی اقدار کی تربیت ناکام ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایک طرح سے اساتذہ اور والدین دونوں کے اثرات کم ہورہے ہیں کیوں کہ افراد کے درمیان ابلاغ کا عمل گھٹتا جارہا ہے۔

آج ہمارے ملک کی اکثریت نہ صرف اپنے ہی قومی ذرائع ابلاغ کی سرگرمیوں سے بے حد متاثر ہورہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے بیرونی ذرائع ابلاغ خصوصاً ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے گہرے اثرات قبول کررہی ہے۔ آج اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ایک بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے اور

اس پوری سماجی تبدیلی کا اہم ترین وسیلہ ذرائع ابلاغ ہی کے اثرات ہیں اور یہ اثرات قومی اور بیرونی دونوں ہی ذرائع ابلاغ کی یورش کا نتیجہ ہیں۔ خصوصاً نئی نسل کے اخلاقی طرزِ عمل، اقدار کی پامالی اور رویوں میں گراوٹ کو دیکھ کر صدمے سے دوچار ہونا لازمی ردِ عمل ہے۔

خصوصاً ہندستان بھرمیں سیاراتی مواصلات کے ذریعہ بیرونی ٹیلی ویژن پروگراموں کو متعارف ہونے کے بعد سے عوام کا ایک خاصہ حصہ اس بات کا شاکی ہے کہ یہ پروگرام ہمارے معاشرے میں رہنے بسنے والوں کے طرزِ عمل، ان کے رویوں اور رائے پر گہرے منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ چاہے وہ بچے ہوں یا بڑے، کتابوں سے اپنا رشتہ توڑ رہے ہیں اور نیتجتاً اندیشہ یہ ہے کہ عملی معیارات مزید روبہ زوال ہوں گے۔ذرائع ابلاغ کے منفی اثرات کا ایک اور جدید نمونہ بصری کھیل یا Video Games بھی ہیں جو بچوں کو تفریح اور معلومات مہیا کرنے کے لیے ایجاد ہوئے مگر اس ذریعہ ابلاغ نے مقبولیت پانے کے ساتھ ساتھ متنازعہ حیثیت بھی اختیار کرلی ہے۔ اس نے بچوں میں طبی، نفسیاتی، معاشرتی اور تعلیمی ہر طرح کے مسائل پیدا کیے ہیں۔ خصوصاً ایشیائی ملکوں میں وسیع پیمانے پر اس بارے میں تشویش کا اظہار ہو رہا ہے کیوں کہ تجارتی سطح پر زیادہ نفع کمانے کے چکر میں ان بصری کھیلوں کے تیار کنندگان نے اس میں ایسے کھیلوں کی بھرمار کردی جو مار کٹائی اور لڑائی جھگڑوں پر مبنی ہیں۔ نتیجہ بچوں میں تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

ہندستان میں خصوصاً سلکی ٹیلی ویژن یا Cable Television نے معاشرے میں نت نئے رویوں کو فروغ دیا ہے۔ دوسری طرف اس سے فرد اور معاشرے پر جداگانہ اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ذرائع ابلاغ آج نہ صرف لوگوں کے خیالات، ان کے طرز زندگی و معاشرت پر اثر پذیر ہوئے ہیں بلکہ یہ مقامی اور عالمی واقعات کو بھی ظہور میں لاتے ہیں۔ ان کی تیز رفتاری اور پھیلاؤ کے باعث آج دنیا سکڑ کر ایک چھوٹا سا نقطہ بن چکی ہے۔

قوموں اور ملکوں کے درمیان فاصلے، زبان اور جغرافیائی حدود اب رکاوٹ نہیں بن سکتے جس کا واضح مظہر یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں انسانوں پر کوئی مصیبت آئے اس کی اطلاع آن واحد میں ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اس طرح ذرائع ابلاغ اگر ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں اور حکومتوں کو دنیا کے دیگر خطوں میں موجود مسائل، مصائب اور غذائی قلت کے بحران سے آگاہ نہ کرتے تو کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کے لیے بین الاقوامی تعاون ایک حقیقت نہ بن پاتا۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ذرائع ابلاغ نے فرد کی زندگی پر ناقابل یقین اثرات مرتب کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں جدید ذریعہ ابلاغ ٹیلی ویژن نے گھر کو، گھر والوں کے لیے دلچسپی کے ایک مرکز کے طور پر مضبوط اور مستحکم کیا ہے، شادی شدہ زندگی اور خاندانی رشتوں پر خوش گوار اثر ڈالا ہے وہیں اسی ٹیلی ویژن نے اخلاق و آداب کو منفی انداز میں متاثر کیا ہے۔ مثلاً ٹیلی ویژن نے ملنساری کو تقریباً ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے آج گھر آنے والے ملاقاتی مہمان کم اور مصیبت زیادہ سمجھے جانے لگے ہیں کیوں کہ ٹیلی ویژن کے دلچسپ پروگراموں کی وجہ سے میزبان ان پر پوری توجہ نہیں دے پاتا۔ اس طرح یہاں ٹیلی ویژن کے اشتہاروں نے تجارتی اشیا اور گھریلو سامان وغیرہ کے انداز اور ڈیزائن کو ترقی دینے میں بڑا کام کیا ہے وہیں خواہ مخواہ کی ایک مقابلے کی دوڑ بھی شروع کروادی ہے۔ جس کے باعث گھر کے مقررہ بجٹ میں الٹ پھیر نے معاشی مسائل کو فروغ دیا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ ابلاغ عامہ کے یہ ذرائع اس چاقو کی طرح کام کررہے ہیں جس سے پھل بھی کاٹا جاسکتا ہے اور کسی کا گلا بھی۔ مطلب سارا انحصار استعمال کرنے والے پر ہوتا ہے کہ وہ کس نیت اور مقصد سے اس کا استعمال یا استحصال کرتا ہے۔

جمہوری معاشرے میں ذرائع ابلاغ پر دو بڑے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ ۱۔ سے ایک واچ ڈاگ یا چوکی دار کے طور پر جمہوری اصولوں اور روایات کی رکھوالی کرنا پڑتی ہے اور ساتھ ہی اسے معاشرے کے لیے آئینے کے طور پر کام کرنا پڑتا ہے یعنی

معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی حالات کی صحیح تصویر کشی کر کے معاشرے کا عکس عوام کے سامنے پیش کرے تا کہ وہ حالات کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کر سکیں۔

آزادئ وطن کے فوراً بعد ذرائع ابلاغ میں سب سے زیادہ اہمیت اخبارات و رسائل کو حاصل تھی۔ کیوں کہ ٹیلی ویژن تب تک یہاں پہنچا نہیں تھا اور ریڈیو سرکاری بھونپو کہلاتا تھا۔ 1924 میں ریڈیو نشریات کے آغاز کے باوجود 1947 تک بھی ریڈیو صرف تفریح ہی کا ذریعہ تھا۔ ورنہ اسے صرف حکومت وقت کے حق میں رائے عامہ کو استوار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ریڈیو باوجود ایک طاقتور ذرائع ابلاغ ہونے کے اپنے وجود کو منوانے میں 1960 تک بھی جدوجہد کرتا رہا۔ پہلا ریڈیو اسٹیشن کلکتہ میں 1924 میں قائم ہوا تھا اور دلی کے ریڈیو اسٹیشن کا آغاز 1925 میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی تقریر سے ہوا جس کا عنوان تھا اردو بازار۔ یہ وہ دور ہے جب شمالی اور جنوبی ہندستان میں ہر طرف اردو کا بول بالا تھا اور اردو والے اردو زبان اور ادب کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف تھے۔

پھر ہمارے ملک میں 1959 ٹیلی ویژن کا دور شروع ہوا۔ لیکن پھر وہی بات کہ یہ ذریعہ ابلاغ بھی سرکاری ملکیت بن کر ابھرا۔ نتیجے میں اس پر بھی عوام کی اس بے یقینی نے اپنا اثر چھوڑا۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اخباری بیانات پڑھ کر قارئین ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں اسی طرح ٹیلی ویژن دوسری طرف تفریح کے نام پر ناظرین کو مسلسل افیون دیے جا رہا ہے۔ رہا ریڈیو، تو آج اس کی مقبولیت میں کمی کی اہم ترین وجہ مسابقتی دوڑ، اس کے سننے والوں کی تعداد میں کمی اور غیر معیاری پروگراموں کے علاوہ اپنی انفرادیت کو چھوڑ کر ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی طرح پروگراموں کی پیش کش رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ابتدا میں ٹیلی ویژن کے آغاز پر جو عملہ اس میں شامل ہوا۔ وہ زیادہ تر آل انڈیا ریڈیو کا ہی اسٹاف تھا۔ نتیجے میں ریڈیائی پروگراموں کا بصری رنگ روپ ہم تک پہنچا۔ مگر اس کا نقصان صرف ریڈیو ہی کو ہوا۔ جب کہ

یلی ویژن فائدے میں ہی رہا۔ یہ تو تھے وہ منفی نکات جن کے ذریعے میں آپ تک برقیاتی ذرائع ابلاغ کے سماجی اثرات کا خلاصہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ آیئے اب میں اپنے موضوع کے دوسرے پہلو یعنی اردو زبان وادب کے فروغ میں ذرائع ابلاغ کے حصے پر روشنی ڈالتا چلوں۔ ذرایع ابلاغ میں جہاں تک صحافت کا تعلق ہے اس میں اردو زبان کے اخبارات کا رول ہمیں ابتدا تا انتہا بہت واضح اور پراثر انداز میں نظر آتا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں اس لیے نہیں جاؤں گا کہ یہ نہ تو میرا موضوع ہے اور نہ ہی میر امیدان۔

برقیاتی ذرائع ابلاغ میں ٹیلی ویژن کے مقابلے ریڈیو، اردو زبان اور ادب کی ترقی اور فروغ میں آگے آگے شاید اس لیے بھی آپ کو ملے گا کہ اس کی عوامی خدمت کی عمر بہرحال ٹیلی ویژن سے زیادہ ہے۔

جنگِ آزادی میں اردو زبان کا جو بھی عملی حصہ رہا ہے وہ بھی ہمارا موضوع نہیں مگر اس کے اثرات پر ہمیں گفتگو ضرور کرنی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ہندستان کی تقسیم نے جہاں دو مذاہب کے ماننے والوں کے بیچ ایک لکیر کھینچ کر علاحدگی اور فرقہ واریت کو جنم دیا۔ وہیں اس تقسیم کے منفی اثرات نے اردو جیسی سیکولر اور عملی اعتبار سے مکمل ہندستانی زبان کو بھی ایک مذہبی زبان کے نام پر سیاسی غلاظت میں گھسیٹ ڈالا۔ نتیجے میں ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے اس کی ترقی، اس کے فروغ اور اس کے تمام تر سماجی حقوق پر ایک طرح سے رکاوٹ ڈال دی گئی۔ آزادی کے بعد کے حالات اور خصوصاً تقسیم کے صدمے سے سہمے اور اپنے مستقبل سے مایوس اردو والوں نے جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی کافی عرصے تک ایک سیاسی مصلحت پسندی کے باعث توجہ نہیں دی۔ اس طرح اردو اپنوں ہی کی لاپروائی کا شکار بنی۔ یقینی بات تھی کہ ذرائع ابلاغ نے بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں بس اتنا ہوا کہ دستور کی منظور ۱۴ (چودہ) زبانوں میں اس کی شمولیت کے ناطے آل انڈیا ریڈیو دلی ہفتہ میں ایک بار آدھے گھنٹے کے لیے اس زبان کا ایک پروگرام ''اردو مجلس'' کے نام سے شروع ہوا۔ جو آج بھی جاری ہے۔

ہاں اب اس کا دورانیہ ہفتہ میں روزانہ ایک گھنٹے کا ہوگیا۔ 1948 میں اردو کے سب سے بڑے مرکز حیدرآباد میں پولس ایکشن تک، ریڈیو نشریات اردو ہی میں ہوتی تھیں۔ بلکہ 80 فی صد سے زیادہ پروگرام اردو ہی میں نشر کیے جاتے تھے باقی 20 فی صد میں تلگو، مراٹھی اور کنڑ شامل تھیں۔ یہ پروگرام دکن ریڈیو سے نشر ہوتے تھے۔ جس کا آغاز 1926 میں ہوا تھا اور جس کا خاتمہ 1948 میں ہوا اور اردو نشریات کا بھی۔ 1966 تک بھی اردو پروگرام صرف مسلمانوں کی عیدوں، تہواروں کے لیے مخصوص تھے۔ ان کی کوئی مسلمہ حیثیت نہیں تھی 1966 میں نیرنگ پروگرام کے آغاز کے ساتھ ریڈیو میں اردو زبان وادب کا نشاۃ ثانیہ شروع ہوا۔ حالاں کہ اس سے قبل دلی ریڈیو اسٹیشن اپنی بیرونی نشریات میں اردو سروس شروع کرچکا تھا مگر یہ ہندستان میں موجود اردو والوں کے لیے اس طرح سے نہیں کہ برابر تھا کہ اس کا نشریاتی علاقہ صرف اور صرف پاکستان تھا۔ اس لیے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کی خدمات کو ہی ریڈیو کی اردو خدمت کہا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ دلی ریڈیو اسٹیشن سے اردو سروس 12 گھنٹے سے زیادہ وقت کے لیے نشر ہوتی ہے جب کہ حیدرآباد سے اردو میں ریڈیو پروگرام صرف دو گھنٹوں کے لیے نشر کیے جاتے ہیں اگر ہم ہفتے میں ایک بار ہورہے خواتین کے پروگرام، بچوں کے پروگرام اور طالب علموں کے پروگراموں کو شامل کریں تو یہ اوقات اوسط روزانہ ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں ہیں۔ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں ریڈیو کی نشریات نہ صرف یہ کہ اردو زبان وادب کی تمام اصناف سخن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں حصہ لینے والے وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جن کے مقام اور فن کو ادبی دنیا مانتی بھی ہے اور انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتی بھی ہے جب کہ ٹیلی ویژن میں یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ خصوصاً ادبی نقطۂ نظر سے ٹیلی ویژن پروگرام تیار ہی نہیں کیے جاتے ہیں اس کے برعکس ریڈیو میں ان پر زیادہ توجہ دی جاتی رہی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً:

ریڈیو کو ابتدا ہی سے اردو کے نامور ادیبوں، شاعروں، نقادوں، ڈرامہ نگاروں کا نہ صرف قلمی تعاون ملتا رہا بلکہ ان میں اکثر وبیشتر ریڈیو کی ملازمت میں عرصہ

دراز تک رہے۔ جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پطرس بخاری، مجاز، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، عشرت رحمانی، ڈاکٹر مسعود حسین رضوی وغیرہ اور ان کے بعد کی نسل میں رتن سنگھ، رفعت سروش، زبیر رضوی، اظہر افسر، متین سروش، امیر احمد خسرو وغیرہ شامل ہیں۔

ریڈیو پروگراموں میں نہ صرف ڈراموں کی پیش کش پر خاص توجہ رہی بلکہ ریڈیائی فیچرز بھی ریڈیو کی ہی خصوصیت ہے۔ اس طرح ریڈیو نے ڈرامے کے ختم ہوتے ہوئے اس فن کو نئی زندگی اور روشنی عطا کی۔ جو فن فلموں کی ترقی اور تھیئٹر کے خاتمے کے باعث بہ تدریج گمنامی اور معاشی پریشانی کے دور سے گزر رہا تھا ساتھ ہی ان ڈرامہ نگاروں کا فیچر رائٹنگ کے خصوصی تربیتی پروگراموں کے ذریعے ایک اور وسیلہ آمدنی فراہم کیا۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں ڈرامہ نگاری کا فن آج صرف اور صرف ریڈیو کے باعث سانس لیتا نظر آتا ہے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ اردو تھیئٹر کا خاتمہ تو فلم کی ترقی کے باعث تقریباً ہو ہی چکا تھا۔ تھیئٹر کے تمام لکھنے والوں کے لیے دلی، ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، کلکتہ، رتنا گیری، اورنگ آباد، پربھنی، گلبرگہ اور بھوپال میں ہورہے اردو ریڈیو پروگراموں نے بہت ہی وقتی سہارے کا کام کیا۔

ڈرامے کے علاوہ ریڈیو نے اردو شاعری کے فروغ میں جو بھرپور رول ادا کیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ موسیقی کے فن سے واقف فن کاروں کی ایک پوری نسل صرف اور صرف اردو زبان سے ہی واقفیت کے باعث ایک عجیب کشمکش سے دوچار تھی۔ روزی چھن جانے سے زیادہ انھیں آنے والے کل کی فکر نے پریشان کر رکھا تھا۔ ایسے میں آل انڈیا ریڈیو نے ان سب کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ جن میں شاعر بھی تھے، فن کار بھی تھے، موسیقار بھی اور سازندے بھی اس طرح اردو تہذیب سے وابستہ ہزاروں افراد نہ صرف روزگار سے جڑ سکے بلکہ اس طرح انھوں نے اردو زبان و شاعری کی خدمت کے سلسلے کو بھی برقرار رکھا۔

ریڈیو کی خدمت یہیں پر ختم نہیں ہوتی، ریڈیو نے افسانہ نگاروں، کہانی

کاروں، نقادوں، اردو پیشہ تدریس سے وابستہ اساتذہ اور طالب علموں سبھی کے لیے مواقع فراہم کیے۔ اس طرح یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیو نے نہ صرف اردو زبان بلکہ اس کے ادب اور تہذیب کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب رہی بات اس کے فی صد کی کہ کتنا بہت کچھ ہونا تھا اور کیا کچھ نہیں ہو پایا۔ تو اس کا جواب ہم سیاست دانوں سے طلب کریں جو اردو کی خدمت کو جانتے اور مانتے ہیں۔ جنگ آزادی کے نعروں اور نغموں کی گرمی محسوس بھی کرتے ہیں، اردو والوں کی قربانیوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن کب؟ انتخابات سے پہلے اور پھر... دوبارہ انتخابات سے پہلے۔ ورنہ اونچے ایوانوں میں بیٹھ کر یہ جب عوام کو بھول سکتے ہیں تو عوامی زبان کو کیا یاد رکھیں گے۔ ہاں یہ اور بات کہ جب کبھی اپنے مفہوم اور مقصد اور سیاسی ضرورتوں کے اظہار میں یہ ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر انھیں یہی اردو یاد آتی ہے۔ اس کے شعر بھی یاد آتے ہیں اور انھیں ایوان بالا اور ایوان زیریں میں پڑھ کر چاہے وہ بے بحر اور ساقط وزن کیوں نہ ہو جائیں۔ وہ ضرور داد حاصل کرتے ہیں، جب کہ ان شعروں کے خالق کو اس کا حق دلوانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ خیر میں موضوع سے بھٹک رہا ہوں لیکن کیا کیا جائے بات جب اردو کی آتی ہے تو باوجود اس زبان کی شیرینی کے کچھ کڑواہٹ ضرور منھ کا مزہ بدل جاتی ہے۔

• **اب کچھ باتیں ٹیلی ویژن کی :** آزادی کے بعد کافی عرصے تک ریڈیو ہی تفریح اور اطلاعات کا واحد ذریعہ رہا۔ یہ شاید 1970 کی بات ہے کہ دلی میں ملک کا پہلا ٹیلی ویژن اسٹیشن شروع ہوا۔ وہ بھی Black & White میں لیکن اس کی نشریات صرف چند گھنٹوں کے لیے اور وہ بھی لوک سنگیت، کرشی درشن (کسانوں کا پروگرام) یا پھر نوٹنکی وغیرہ کے علاوہ سرکاری پروگراموں کے لیے مختص تھیں۔ یہ پروگرام آج بھی ہوتے ہیں اور کل کی طرح آج بھی اتنے ہی غیر معیاری اور ناپسندیدہ پروگرام کہلاتے ہیں۔ وجہ صرف اور صرف یہ رہی ہے کہ یہ ذریعہ ابلاغ سرکاری ملکیت ہونے کے باعث عوامی پسند و ناپسند کو جاننے میں کبھی کوشاں نہیں رہا بلکہ آقاؤں کی خوشنودی اور ان

کی پسند ناپسند پر زیادہ کام کرتا رہا۔ اب جب سے یہ پرسار بھارتی نام کے خودمختار اداروں کے تحت دیا گیا ہے کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ عوامی پسند کو ملحوظ رکھ کر پروگرام بنائے گا۔ لیکن سکی ٹیلی ویژن نے آکر عوامی شعور کی آنکھوں کو اتنا خیرہ کر دیا ہے کہ اب مشکل ہی نظر آتا ہے کہ دوردرشن اپنی دردشا سے نکل پائے گا۔

اپنے روز آغاز سے آج تک بھی دوردرشن نے اردو پروگراموں کا جو خود ساختہ معیار بنا رکھا ہے اس میں ادب کا عمل دخل صرف نام کے لیے ضرور ہے مگر اس کی افادیت ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ مشکوک ہے۔ اکثر پروگراموں میں نامعلوم افراد کے غیر معیاری پروگرام جو شاید بہت سستے بن جاتے ہیں اردو پروگراموں میں نظر آتے ہیں لیکن نامناسب تشہیر کے باعث لوگ انھیں دیکھ نہیں پاتے۔ نتیجے میں کسی بھی طرح کی اصلاح ان میں مشکل ہی نظر آتی ہے۔ ایک زمانے میں دوردرشن کم از کم مشاعروں کے نام پر اردو والوں کی خوشنودی حاصل کر لیتا تھا۔ مگر پچھلے سات آٹھ سالوں سے یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

دوردرشن اپنے چند ٹیلی ویژن مراکز سے اردو کی خبریں بھی دس منٹ کے لیے نشر کرتا ہے جن میں بولی جانے والی اردو مشکل سے لکھی جاسکتی ہے کیوں کہ اس میں زیادہ تر الفاظ ہندی یا انگریزی ہی کے سننے کو ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں حیدرآباد اور دلی کے ٹیلی ویژن مراکز کی نشریات پھر دوسروں کے مقابلے بہتر ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار ہونے والا حیدرآباد ٹیلی ویژن کا اردو پروگرام انجمن ایسے وقت دکھایا جاتا ہے جب بڑے دفتروں اور بچے اسکولوں سے واپس ہوتے ہوئے سڑکوں پر ہوتے ہیں اور گھر کی خواتین ان سب کے گھر لوٹنے کی منتظر تیاریوں میں مصروف۔ نتیجہ یہ پروگرام کب ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف وہ لوگ ہی بتا پاتے ہیں جو خود اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ لوگ جن کے افراد خاندان اس میں شریک رہتے ہیں۔ مگر بقول کسی کے "نیں ماموں سے نکٹے ماموں سہی" کچھ تو ہوتا ہے۔

اردو والوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کے بعد ایک اردو محاذ قائم کیا۔ یہ

بات ہے 1998 کی اس محاذ میں ملک بھر سے زبان کے چاہنے والے ادیب، شاعر، صحافی، فن کار، دانشور شامل تھے جس کی روح رواں محترمہ شمع زیدی تھیں۔ یہ اردو محاذ وزیراعظم سے لے کر مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات اور دور درشن کے اربابِ مجاز سے وفد کی شکل میں ملا جس کا مقصد صرف اور صرف ایک ہی تھا کہ جب ہندستان کی ہر زبان کے لیے ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن مختص ہوسکتا ہے تو اردو کے لیے کیوں نہیں؟ سوال بہت ہی تلخ حقیقت پر مبنی تھا۔ مگر جواب دینے والوں نے حقیقت کا سامنا کرنے سے انکار کردیا۔ جواب یہ دیا گیا کہ کچھ مراکز پر ہفتہ میں ایک بار آدھے گھنٹے کا پروگرام اور چند مراکز پر 10 منٹ کی اردو نیوز اور کیا چاہیے یہ کافی نہیں ہے کیا؟ یہ میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کررہا ہوں۔ مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات ونشریات کے ذمہ دار عہدے دار کا تحریری جواب کمیٹی کے پاس موجود ہے۔ بہر حال حالات جو بھی تھے ہم مایوس نہیں ہوئے کوشش جاری رہی اور ایک مکمل اردو ٹیلی ویژن چینل کا خواب جو شمع زیدی اور ساتھیوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اس وقت پورا ہوا جب 2001 میں راموجی راؤ نے E-TV اردو کا آغاز کیا۔

یہ چینل اردو والوں کی برسوں پرانی آرزو کی تکمیل بن کر سامنے آیا۔ دنیا کا پہلا مکمل اردو چینل جس کے آغاز کو بھی ہم اردو زبان وادب اور فنون لطیفہ کا نشاۃ ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ چینل کس حد تک کام کررہا ہے، آپ کس طرح اس سے استفادہ حاصل کررہے ہیں یہ بات پھر ایک بار دہراؤں گا کہ ابلاغ عامہ کے ذرائع اس چاقو کی طرح ہیں جس سے پھل بھی کٹتا ہے اور گلا بھی۔ اب سوال یہ کہ استعمال کرنے والے کا مقصد کیا ہے۔ E-TV اردو جن ارادوں اور رامنگوں سے شروع ہوا وہ اپنی جگہ راموجی راؤ صاحب کا مقصد اپنی جگہ اردو والوں کی خواہشوں کی تکمیل اپنی جگہ۔ اردو والوں کی ذمہ داری بھی اپنی جگہ، چینل کا چلانا ایک طرف اور اردو والوں کی توجہ اور سرپرستی دوسری طرف۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمیشہ کی طرح اردو والوں کا رویہ وہی رہا جو رہتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آغاز پر دھوم دھام۔ اس کے بعد خاموشی، سکوت، بے حسی، سناٹا، وجہ،

نامعلوم ہاں ہم اچھے تنقید نگار ہیں کیوں کہ اردو ادب میں یہ سب سے آسان صنف سخن ہے۔ جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ آتا ہے چوکھا۔ یہ کام ہم ضرور کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے مگر میں یہ کہنا چاہوں گا اپنے تمام تر 35 سالہ تجربات کی روشنی میں۔ خصوصاً الکٹرانک میڈیا یا برقیاتی ذرائع ابلاغ کے تجربات کی روشنی میں کہ کوئی زبان یا اس کا ادب یا اس کی تہذیب صرف زبانی جمع خرچ پر محفوظ نہیں ہو پاتی۔ اس کے لیے عملی طور پر اس کی سرپرستی لازمی ہے۔

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس کی خصوصیت برق رفتاری ہے۔ ہر جان دار اور بے جان چیز بڑی تیزی سے سفر کررہی ہے۔ یہ تمام تر معجزے سائنس اور ٹکنالوجی کی عظیم ترقی کے مرہون منت ہیں۔ اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں Global Village میں تبدیل کردیا ہے یہ علاحدہ بحث کا موضوع ہے کہ ہم اپنے پڑوسی سے ناواقف ہیں ہوسکتا ہے کہ آنے والے کل میں ہمیں اخبار خریدنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ کا پسندیدہ اخبار بٹن دبانے سے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ آج آپ کے لیے خبریں اور خبرنامے بے خبری پھیلا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اطلاعات کی بھرمار ہے۔ مگر علم مفقود ہے درجنوں علم وفنون پر روزانہ تمام زبانوں میں کروڑوں بلکہ اربوں لفظوں کی اشاعت کا عمل پورے کرۂ ارض پر جاری ہے۔ لیکن آگہی مفقود ہے ذرائع ابلاغ زیادہ سے زیادہ اطلاعات مگر کم سے کم معلومات فراہم کررہے ہیں۔ یوں علم اصطلاحات کی بھول بھلیوں میں گم ہوکر رہ گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لفظ ''خبر'' کے معنی تھے واقفیت، احوال، اعلان، اطلاع، ظاہر یا عیاں کرنا۔ مگر آج کل اس کے ساتھ ایک اور لفظ مل گیا ہے افواہ۔ پوری دنیا میں آج کل لاکھوں ٹن کاغذ صرف ہورہا ہے ریڈیو اور ٹی وی پر جو اربوں الفاظ بولے جارہے ہیں۔ ان میں خبر کو دو لفظوں میں قید کردیا گیا ہے۔ اطلاع اور افواہ Information & Speculation یہی وجہ ہے کہ خبر سے علم اور آگہی غائب ہو چلے ہیں۔

خیر صاحب تاریخ بہت بہترین منصف ہے کھرے کھوٹے کا فیصلہ وہ خود

کردے گی۔ مگر جو ہمارے بس میں آج ہے وہ تو ہم کر ہی سکتے ہیں کم از کم ان سرپھروں کا ساتھ دیں جو اردو کے بہتر مستقبل کی امید کا دیا روشن کیے بیٹھے ہیں اگر چہ کہ وہ مخالف ہواؤں کی زد پر ہے زبانی نہیں عملی ثبوت دیں۔ اردو لکھیں، اردو پڑھیں اور پڑھائیں۔ کیوں کہ یہ ایک مکمل تہذیب ہے بہ قول فیض احمد فیض کے

حلقہ کیے بیٹھے رہو ایک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

سہیل انجم

عوامی ذرائع ابلاغ اور ہمارا معاشرہ
منفی اور مثبت اثرات

ذرائع ابلاغ یعنی اخبارات ، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر، ہوم ویڈیو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ وغیرہ کی آج پوری دنیا میں زبردست اہمیت ہے۔ آج کی دنیا ٹیل کی سنگ پر نہیں ابلاغ کے انہی ذرائع پر ٹکی ہوئی ہے اور یہ ذرائع ہماری سماجی ، معاشی ، تجارتی ، تعلیمی ، تہذیبی ، ثقافتی اور معالجاتی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہورہے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ اور گوشہ نہیں ہے جوان ذرائع کی پہنچ اور دسترس سے دور ہو۔ کسی ہندی شاعر نے کہا تھا کہ جہاں نہ پہنچے روی وہاں پہ پہنچے کوی۔ یعنی جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوسکتا وہاں شاعر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اب یہ دعویٰ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اب تو یہ کہا جانا چاہئے کہ جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی یا جہاں تک شاعر کا خیال نہیں جاسکتا وہاں بھی میڈیا اور ذرایع ابلاغ وترسیل کے نمائندے پہنچ جاتے ہیں۔ ہم جس گزرگاہ سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے وہاں کیمرے نصب ہورہے ہیں اور

ہم اپنے گھر آنگن میں بیٹھ کر وہاں کے مناظر سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ پھر چاہے وہ عراق کا گڈھا ہو جہاں سے امریکی افواج نے عراق کے معزول صدر صدام حسین کو گرفتار کر کے باہر نکالا یا پھر افغانستان میں تورا بورا کی وہ سنگلاخ پہاڑیاں ہوں جو القاعدہ اور طالبان کی کمین گاہیں تھیں۔ کوئی بھی جگہ ان کی دسترس سے دور نہیں ہے۔

ان ذرایع کی برکتوں سے وسیع و عریض دنیا سمٹ کر ہمارے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں آگئی ہے اور گھر کی کھڑکیاں کھول کر پورے عالم کا نظارہ کرنا اب بہت چھوٹی سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم ایک کمرے میں ایک میز پر بیٹھ کر اور محض ایک بٹن دبا کر آنِ واحد میں دنیا بھر کی سیر کر سکتے ہیں۔ ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ و ترسیل کی اس ترقی کو دیکھ کر ہی دورِ جدید کے الیکٹرانک مسیحا مارشل میکلوہان نے آج کی دنیا کو گلوبل ویلیج یا عالمی گاؤں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس ٹکنالوجی نے شاہراہِ ترقی پر اتنی طویل اور اتنی اونچی جست لگائی ہے کہ انسانی جذبات واحساسات اور خیالات کو بھی اس نے بالواسطہ طور پر متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر ہم ایک بات اور دیکھتے چلیں کہ آج جہاں ذرائع ابلاغ ہماری زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہیں کوئی ایسا بھی ہے جو ذرائع ابلاغ پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جی ہاں اور وہ ہے آج کا بازار۔ بازار نے ان ذرائع کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے اور یہ گرفت جتنی سخت ہوتی جارہی ہے یہ ذرائع اتنی ہی بلند آواز میں بازار کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ہم یعنی انسان بھی اس منڈی کے تابع مہمل بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ چاہے خبریں ہوں، تجزیے ہوں، ڈرامے ہوں، سیریل ہوں، کہانیاں ہوں، یا فلمیں ہوں سب پر بازار حاوی ہو گیا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور بازار دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن گئے ہیں اور ایک دوسرے کو استعمال کر رہے ہیں۔ گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے تکملہ ہیں۔ اب صورت حال یہ بن گئی ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی محال ہے۔ بازار ذرائع ابلاغ کو زندہ اور صحت مند رکھنے کے لیے ہر لمحہ تازہ خون فراہم کرتا ہے اور ذرائع ابلاغ

بازار کی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ منڈی کی تشکیل بھی کرتے ہیں اور منڈی ذرائع ابلاغ کو سامان زندگی فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح صحافت بھی خواہ طباعتی ہو یا نشریاتی بازار کی شے بن کر رہ گئی ہے۔ انٹرٹینمنٹ اور نیوز چینلز ایک ایک دوکان لے کر بیٹھ گئے ہیں جہاں سے وہ اپنے اپنے مال کا پرچار اور پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ عام لوگوں کا سب سے زیادہ واسطہ جن چیزوں سے پڑتا ہے وہ ہیں انٹرٹینمنٹ چینلز، نیوز چینلز، ریڈیو اور اخبارات، یعنی الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں۔

اگر ہم نیوز چینلز اور اخبارات کا تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ دونوں جگہوں پر کچھ مثبت چیزیں ہیں تو کچھ منفی بھی ہیں۔ اگر صحافت کے پیشے سے وابستہ افراد ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کے رگ و پے میں رچ بس گئے، کرپشن کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجادم دے رہے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ کچھ ایسا بھی کرجاتے ہیں جو انسانی زندگی او رمعاشرے پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب سے الیکٹرانک میڈیا کا دور آیا ہے اور نیوز چینلز شروع ہوئے ہیں صحافی برادری زبردست بھاگ دوڑ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ ان میں اس قدر مقابلہ اور ہوڑ ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے ہی میں بقا کا راز سمجھتے ہیں۔ پھر تو چاہے جائز راستہ اختیار کرنا پڑے یا ناجائز سب روا ہے۔ جب سے انوسٹی گیٹیو اسٹوریز کا دور شروع ہوا ہے یہ بھاگ دوڑ اور تیز ہوگئی ہے اور ایکسکلیو سیو خبروں کی تلاش میں جائز ناجائز سارے راستے اختیار کیے جارہے ہیں۔ اب تو اپنی زبان سے اپنی ہی تعریفوں کے پل بھی باندھے جانے لگے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا یہ عالم ہے کہ بعض چینلز تحقیقاتی رپورٹوں کے نشریے کے دوران ''صرف اسی چینل پر یا ایکسکلیو سیو'' کی کلپ لگانا نہیں بھولتے۔ اس مقابلہ آرائی نے سنسنی خیزی کو بری طرح بڑھاوا دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں معیار پست ہوکر رہ گیا ہے۔ سنسنی پیدا کرنے کے لیے غیر اخلاقی طریقہ کار اپنانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی عصمت دری کی رپورٹ پیش کرنی ہو اور اس واقعہ کی کوئی

تصویر ان کے پاس نہ ہو تو وہ لوگ فرضی کردار پکڑ کر عصمت دری کی ایکٹنگ کرواتے ہیں اور ان کی تصویر کشی کر کے رپورٹ کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ یہ Re-enactment رپورٹوں کو سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تا کہ ناظرین اپنا زیادہ تر وقت اسی چینل کو دیں۔ Re-enactment کے اس عمل میں اصل واقعہ اور اس کے اہم پہلوؤں کو دکھانے کے بجائے اس کے جنسی پہلو کو زیادہ ابھارا جاتا ہے تا کہ لوگ جنسی تلذذ بھی حاصل کر سکیں۔ یہ طریقہ کار غیر اخلاقی ہے اور صحافتی معیار کے خلاف بھی ہے۔ یہ صورت حال کسی بھی واقعہ کو نمک مرچ لگا کر اور چٹخارے دار بنا کر پیش کرنے سے کہیں آگے کی چیز ہے اور اسے ایلو جرنلزم یا زرد صحافت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

پریس کونسل آف انڈیا نے صحافیوں کے لیے خبروں اور رپورٹوں کی اشاعت کے سلسلے میں Guide Lines وضع کی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان کی بری طرح پامالی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پریس کونسل کا کہنا ہے کہ ایسی خبروں یا رپورٹوں کی نشر و اشاعت سے قبل ان کی تصدیق کر لینی چاہیے جن سے متعلقہ شخص یا شخصیت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہو اور اگر اشاعت کے بعد متعلقہ شخص جس پر برا اثر پڑا ہے، اپنا جوابی ردعمل پیش کرے تو اسے بھی شائع کیا جانا چاہئے۔ لیکن اکثر اوقات اس ضابطے پر عمل نہیں کیا جاتا جس کے سبب جھوٹی خبریں نشر ہو جاتی ہیں یا اخبارات میں شائع ہو جاتی ہیں۔ یا کسی واقعہ کا صرف ایک ہی پہلو سامنے آپاتا ہے۔ دوسرا قارئین اور ناظرین کی نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔

اسی طرح عصمت دری، اغوا اور جنسی استحصال کے تعلق سے بھی پریس کونسل کی ہدایات ہیں۔ پریس کونسل کے مطابق ''عصمت دری، خاتون کے اغوا یا کسی بچے کے جنسی استحصال سے متعلق رپورٹوں کی اشاعت کے وقت ان چیزوں سے گریز کیا جانا چاہئے جن سے خاتون کی رازداری متاثر ہوتی ہو یا کسی کے کردار پر سوالیہ نشان لگتا ہو۔ ان جرائم کے شکار خواتین اور بچوں کی تصاویر کی اشاعت سے بھی بچنا چاہیے اور ایسی تفصیلات سے

گریز کرنا چاہیے جن سے متعلق خاتون یا بچے کی سماجی حیثیت متاثر ہو جائے۔''

میں یہاں گجرات کی بلقیس یعقوب رسول کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے ساتھ پانچ ماہ کے حمل کے دوران زیادتی کی گئی اور اجتماعی طور پر اس کی عزت لوٹی گئی۔ اس کے سامنے اس کے خاندان کے 14 لوگوں کا قتل بھی کردیا گیا۔ آج بلقیس یعقوب رسول کی تصویر اخباروں میں چھپ رہی ہے اور ٹی وی رپورٹوں میں دکھائی جارہی ہے۔ پریس کونسل کا کہنا ہے کہ ایسی تصویروں کی اشاعت نہ کی جائے جن سے کسی شخص کے سماجی مقاطعہ کا اندیشہ ہوجائے یا سماج ان چیزوں کی اشاعت کے بعد اسے غلط نظر سے دیکھنے لگے۔ لیکن بلقیس کے معاملے میں اس کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ تاہم میں یہ بات بھی کہوں گا کہ صحافیوں کی اس غیر ارادی بددیانتی میں ایک خیر کا پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ اگر بلقیس یعقوب رسول کا معاملہ سامنے نہیں آیا ہوتا تو اس کو انصاف ملنے کی امید بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بعض اخبارات بالخصوص روزنامہ انڈین ایکسپریس نے اچھالا نہ ہوتا تو بلقیس کا معاملہ دبا کا دبا رہ جاتا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ بلقیس کا معاملہ وہ واحد معاملہ ہے جس کی جانچ سی بی آئی کررہی ہے۔ ایسے جانے کتنے معاملات ہیں جو آج بھی دبے پڑے ہیں اور جن کو ابھارنے اور تلاش کرکے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ اگر مظلوموں کو انصاف دلانے کی کوشش میں ان کی کچھ ایسی تشہیر بھی ہوجائے جو تھوڑی دیر کے لیے بدنامی کا باعث بن جائے تو میرے نزدیک یہ جائز ہے۔

مقابلہ آرائی کے اس دور میں دانستہ یا نادانستہ طور پر صحافیوں سے یہ غیر صحافتی جرم بھی سرزد ہورہا ہے کہ ماورائے عدالت فیصلے سنائے جارہے ہیں۔ میڈیا جس شریف آدمی کو چاہے ویلن بنا کر پیش کردے اور جس کی چاہے پگڑی اچھادے۔ کوئی پوچھنے اور سوال کرنے والا نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں شک وشبہ کی بنیاد پر ہی کسی کی گرفتاری عمل میں آتی ہے تو گرفتار شخص میڈیا کی کرم فرمائیوں کے نتیجے میں عدالتی فیصلے سے قبل ہی مجرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ ایسا فیصلہ سنانے میں میڈیا کے وہ نامہ نگار نسبتاً زیادہ تیزی دکھاتے ہیں جو نووارد ہوتے ہیں جن کے پاس تجربات

ومشاہدات کی کمی ہوتی ہے اور جو اپنی رپورٹوں میں اپنی ناپختگی کا قدم قدم پر ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تجربہ کار سینئر اور پرانے صحافی ایسا فیصلہ صادر کرنے میں سو بار سوچتے ہیں۔ اسے Trail by Media کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچ پاتے کہ گرفتار شخص کے چہرے کو رومال یا کسی کپڑے سے تذلیل آمیز انداز میں چھپا کر لے جاتے ہوئے دکھانے سے اس کے اہل خانہ، اعزا، دوستوں اور رشتے داروں کے دلوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے گرفتار شخص سماج کا سب سے بدبخت اور ذلیل ترین انسان ہے اور اسے تو بس تختۂ دار پر چڑھا دینا چاہئے۔ یوں تو ایسے واقعات روز بروز پیش آتے ہیں لیکن میں جنوبی افریقہ کے جج سراج الدین ڈیسائی کا معاملہ مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں جو کہ ہند نژاد ہیں اور گذشتہ دنوں جنوبی افریقہ سے وہاں کی ایک سماجی کارکن کے ساتھ ممبئی میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ سراج الدین ڈیسائی جنسی جرائم کے خلاف انتہائی سخت جج کی حیثیت سے مشہور ہیں اور انھوں نے متعدد جنسی مجرموں کو سخت ترین سزائیں دی ہیں۔ لیکن جب ان کے ساتھ آنے والی خاتون نے ان پر عصمت دری کا الزام لگایا اور سراج الدین ڈیسائی گرفتار کر لیے گئے تو ان کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ جیسے ان سے بڑا جنس زدہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ متعلقہ خاتون کا کیس اتنا کمزور تھا اور جج کے خلاف بنی گئی الزامات کی چادر میں اتنے سوراخ تھے کہ ان سے خود موصوفہ کا کردار داغدار نظر آنے لگا تھا اور بالآخر جج صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس پورے معاملے کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ جنسی جرائم کے خلاف زندگی بھر جنگ لڑنے والا جج آنِ واحد میں جنسی ویلن بن کر رہ گیا۔ شاید اسی لیے انھوں نے رہائی کے بعد اپنے ردعمل میں کہا تھا کہ میں سب سے پہلے اپنے گھر جا کر اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں، وہ جانتے تھے کہ اس گھناؤنے کھیل سے ان کے اہل خانہ کے دلوں پر کیا گذری ہوگی۔ یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے اور پریس کونسل آف انڈیا کو اس بارے میں مزید ہدایات جاری کرنی چاہئیں۔

لیکن میں یہاں میڈیا کے ان لوگوں کو خراج تحسین بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جنھوں نے پریس کونسل آف انڈیا کی واضح ہدایات کی خلاف ورزی کی، لیکن دوسری طرف انسانیت کی خدمت بھی کی۔ میرا اشارہ پھر گجرات فسادات کی طرف ہے۔ جہاں میڈیا کے جری اور انصاف پسند نمائندوں نے اپنی جان پر کھیل کر دنگائیوں، بلوائیوں اور فسادیوں کی شیطانیت کی کوریج کی۔ اگر الیکٹرانک میڈیا میں این ڈی ٹی وی جو کہ اس وقت اسٹار نیوز کا حصہ تھا اور پرنٹ میڈیا میں انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نے ظالموں اور مظلوموں، فسادیوں اور بے قصوروں اور قاتلوں اور مقتولوں کے نام ظاہر نہ کیے ہوتے تو شاید گجرات فسادات کی کوریج یک طرفہ ہو جاتی اور دنیا یہ نہیں جان پاتی کہ وہاں مودی حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سروں سے کیسی کیسی قیامتیں گزار دی گئیں۔ اگر انڈین ایکسپریس نے خوفزدہ ظہیرہ شیخ کا وہ جھوٹ نہ پکڑا ہوتا، جس میں اس نے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیوں کے پیش نظر غنڈوں، ظالموں اور عصمت کے لٹیروں کو ہی مسیحا قرار دے دیا تھا، تو مدھو سری واستو جیسے بہت سے کریہہ اور داغدار چہروں پر پارسائی کے پردے پڑے رہتے۔ اب حالات بدل گئے ہیں میڈیا میں زبردست انقلاب آ گیا ہے اور ذرائع ابلاغ میں نئے نئے ابعاد (Dimensions) جڑ گئے ہیں۔ لہٰذا پریس کونسل کو اپنی بعض پرانی ہدایات پر از سر نو غور کرنا چاہئے اور ان کو مزید لبرل بنانا چاہئے تاکہ صحافیوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج ہمارا معاشرہ کس قدر کرپٹ اور بدعنوان ہو گیا ہے۔ کرپشن ہمارے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ اب بظاہر یہ کوئی معیوب بات نہیں رہ گئی ہے۔ سیاست دانوں کی سرپرستی ان کی ابن الوقتی اور موقع پرستی یا پھر بدلتے ہوئے معاشی و معاشرتی حالات کے سبب کرپشن بری طرح پھل پھول رہا ہے اور بری طرح پھیلتی اس برائی کو اجاگر کرنے کا کام اگر صحافی حضرات کرتے ہیں تو یہ انتہائی لائق تحسین ہے۔ گویا انتظامیہ کے فرائض میڈیا والے انجام دے رہے ہیں

جب انتظامیہ اور کسی حد تک عدلیہ بھی کرپشن کے کیچڑ میں شرابور ہوچکی ہو تو کسی کو پانی
سے بھری بالٹی لے کر اٹھنا ہی پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو مثالوں کو کرپشن کو بے نقاب
کرنے کی راہ میں سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے ہماری سیاسی اور اجتماعی
زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جانے والی ذہنیت کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیا۔
ایک تہلکہ ڈاٹ کام کا دفاعی سودوں میں رشوت خوری کو بے نقاب کرنا اور دوسرا زی نیوز
کے ایک نمائندے کے ذریعے عدلیہ میں کرپشن کو اجاگر کرنا۔ یہ ذرائع ابلاغ کی ترقی
کا فیض ہے کہ ہم نے ایک سیاسی پارٹی کے صدر کو رشوت لیتے ہوئے اور اسی پارٹی کے
دوسرے لیڈر کو رقم حاصل کرتے وقت یہ کہتے ہوئے دیکھا اور سنا کہ خدا کی قسم پیسہ خدا تو
نہیں مگر خدا سے کم بھی نہیں۔ پریس کونسل آف انڈیا کا کہنا ہے کہ کسی کا انٹرویو بیان لیتے
وقت اس کے علم میں لائے بغیر اسے ریکارڈ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس ہدایت پر عمل کیا گیا
ہوتا تو کیا یہ دونوں برائیاں یا اس طرح کی دیگر برائیاں منظر عام پر آپاتیں؟ اگر بنگارو
لکشمن یا دلیپ سنگھ جودیو کو یہ بتا کر رشوت دی جاتی کہ دیکھو ہم اس کی وڈیو گرافی بھی
کر رہے ہیں اور ہتھیاروں کے سوداگر نہیں بلکہ فرضی اور جعلی دلال ہیں تو کیا یہ لوگ
یوں گرفت میں آپاتے۔ اگر زی نیوز کے نمائندہ نے یہ بتایا ہوتا کہ وہ جن لوگوں کے
خلاف وارنٹ نکلوانا چاہتا ہے ان میں سے ایک اس ملک کے صدر دوسرے چیف جسٹس
ہیں تو کیا گجرات کی ذیلی عدالت کا جج مبینہ طور پر چالیس ہزار روپے رشوت لے کر ان
کے خلاف وارنٹ جاری کر دیتا۔ اس قسم کے کرپشن کو بے نقاب کرنے کے لیے چھپا
رستم کا کیمرہ لے کر نکلنا ہی پڑتا ہے۔ یہ دونوں مثالیں یہ بتاتی ہیں کہ بظاہر صاف
شفاف ماحول کے نیچے کس قدر غلاظت بھری ہوئی ہے اور کرپشن کے بجبجاتے کیڑے
کس قدر تعفن پھیلا رہے ہیں۔ ان دونوں واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کہ جن پر
ملک کے دفاع کی ذمہ داری ہے وہ کس قدر خود غرض اور ملکی سلامتی کے تئیں غیر سنجیدہ ہیں۔
جب کہ عدلیہ میں کرپشن کا مذکورہ واقعہ یہ بتاتا ہے کہ جس عمارت پر ملک میں انصاف
وقانون کی بالادستی کا بار ہے اس کی نیچے کی کڑیاں کس قدر سڑ اور گل گئی ہیں اور یہ سب

کچھ میڈیا والوں کی کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے۔

ذرائع ابلاغ بالخصوص میڈیا جہاں ایک طرف ہمیں خبروں سے واقف کرانے اور ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں رچ بس گئے کرپشن کو بے نقاب کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے وہیں یہ بعض اوقات حکومت کے ہاتھوں کا کھلونہ بھی بن جاتا ہے اور اس کا قصوروار وہ بازار بھی ہے جو ذرائع ابلاغ پر حاوی ہوگیا ہے۔ اگر چینلوں اور اخباروں کو پیسے نہیں ملیں گے تو وہ زندہ کیسے رہیں گے۔ لہٰذا زندہ رہنے کے لیے وہ چیزیں بھی دکھانی ضروری ہوتی ہیں، میڈیا کے ذمہ دار اصولی طور پر جن کے مخالف ہوتے ہیں۔ حکومتیں ذرائع ابلاغ کی ضرورتوں اور مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں اور ان کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ میڈیا میں دیکھا گیا کہ ایک طرف وہ موجودہ حکومت کے فیل گڈ فیکٹر کی ہوا نکالنے اور اس اشتہار بازی کے متوازی تلخ حقائق کو پیش کرنے میں پیش پیش رہے ہیں تو دوسری طرف حکومت کے ان اشتہاروں کو بھی خوب خوب دکھایا گیا جن میں انڈیا شائننگ، درخشاں بھارت یا بھارت اودے کا گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔ انتخابی ضابطہ اخلاق کے نفاذ تک یہ سلسلہ جنگی پیمانے پر جاری رہا۔

یہ تو ہوا وہ معاملہ جو سطح پر نظر آرہا ہے۔ سطح کے نیچے اس سے بھی بھیانک صورت حال ہے۔ حکومتیں میڈیا کے نمائندوں کو مختلف مراعات کے عوض خریدنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ سرکاریں میڈیا کا استعمال کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا اور ان پر اثر انداز بھی ہونا چاہتی ہیں۔ اور الیکٹرانک میڈیا کے اس استعمال کو پرنٹ اینڈ ٹیلی پالیٹکس کہا جاتا ہے۔ یہ سیاست آج کل زوروں پر ہے اور ایک خاص طبقہ اس فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس فن سے میڈیا والوں کی بظاہر برین واشنگ کر کے ان کو آلہ کار بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خبروں کے اس ہلکے پھلکے تجزیہ کے بعد ایک نظر اشتہارات پر بھی ڈالتے چلیں۔ چونکہ یہ اشتہارات بھی چاہے وہ پرنٹ میڈیا کے ہوں یا الیکٹرانک میڈیا کے،

ہم سے اتنے ہی روبرو ہوتے ہیں جتنے کہ خبریں اور تجزیے۔ لہٰذا یہ بھی ہماری سوچ اور فکر کو متاثر کرتے ہیں اور ہم اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب تو تصاویر کی اشاعت میں اتنا کھلا پن آ گیا ہے کہ شرفاء نہ تو اخبارات کے رنگین صفحات کا اپنی فیملی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ٹی وی کے بعض بیہودہ اور فحش اشتہارات کو دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے مانع حمل کے ایک دو اشتہارات فحش انداز میں دکھائے جاتے تھے مگر اب تقریباً بیشتر اشتہارات اسی رنگ میں رنگتے چلے جا رہے ہیں۔ خواہ سوئنگ شرنگ کے اشتہارات ہوں یا موبائل کے کیش کارڈ یا پھر ایک خاص عمر تک پہنچنے والی لڑکیوں کی ضرورت کی چیزوں کے اشتہارات ہوں۔ یہاں تک کہ کاروں کی فروخت کے اشتہارات کو بھی بے حیائی و بے شرمی کا ملمع چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ شرافت و شائستگی کس چڑیا کا نام ہے یہ اشتہار سازوں اور اشتہار بازوں کو نہیں معلوم۔ یا وہ عمداً اور ضرورتاً اس سے گریز کرتے ہیں۔

دراصل یہ بازار ہے جو بے ہودگی، فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دے رہا ہے۔ بازار کی اس بالادستی نے صارفیت پسندی کو بھی اس قدر ہوا دی ہے کہ اب قارئین اور ناظرین کی اپنی کوئی پسند نہیں رہ گئی ہے۔ اب شئے کے بجائے شئے کے تصور اور اس کی امیج کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان میں اصل حقیقت کے بجائے خیالی حقیقت کی نشر و اشاعت ہوتی ہے اور ہم رفتہ رفتہ ایک خیالی ثقافت کے دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ ان اشتہارات نے ہماری پسند اور ناپسند کے معیار کو ختم کر دیا ہے۔ ہمیں کیا کھانا ہے کیا پینا ہے، کب سونا ہے، کب اٹھنا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا دیکھنا ہے، کیسے رہنا ہے، کیسے نہیں رہنا ہے۔ یہ سب اب ہم نہیں بازار طے کر رہا ہے اور ہم اس بازار کی کٹھ پتلی بننے پر مجبور ہیں۔ ان اشتہارات نے انسانی کردار، ہاؤ بھاؤ، بول چال اور طور طریقوں کو بھی متاثر کر دیا ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں انہی اسٹائل کو اختیار کرنے کی دانستہ و نادانستہ کوشش کرتے ہیں جن کی بالواسطہ یا بلاواسطہ نشر و اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی کا ہر شعبہ اشتہار بازی سے متاثر ہے۔ نہ صرف عوامی ذوق کو تبدیل کیا جا رہا ہے

بلکہ مصنوعی ضرورتیں بھی پیدا کی جارہی ہیں۔ پہلے آدمی ضرورت کے تحت چیزیں خرید اکرتا تھا مگراب بازار نے نئی نئی اور مصنوعی ضرورتیں پیدا کردی ہیں۔ اور یہ نئی ضرورتیں ہماری زندگی میں اس طرح داخل ہوگئی ہیں کہ ہم چاہ کر بھی نہیں بچ سکتے۔ یہ اشتہارات ہمارے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کی صلاحیتوں کو بھی متاثر کررہے ہیں اور ان سے نجات پانے کا بظاہر کوئی راستہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ گویا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی کیفیت ہے۔

اسی طرح انٹر ٹینمنٹ چینلز سے بھی ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور ہمارے فاضل وقت کا ایک بڑا حصہ فلموں، ڈراموں اور سیریلوں پر صرف ہوتا ہے۔ یہ بھی بازار کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ فلمیں، ڈرامے اور سیریل عوامی ذوق وشوق کی تکمیل کے تحت نہیں بنائے جاتے بلکہ بازار کی ضرورت کے تحت بنائے جاتے ہیں اور عوام کی سوچ اور ذہنیت کو ایک خاص سمت میں موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندستانی سماج بھی جہاں روحانیت کا بڑا غلبہ رہا ہے اور تہذیب وشائستگی یہاں کی سنسکرتی کا حصہ رہے ہیں، مغربی ملکوں کی مانند عورتوں کو بازاری شئے بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اب عورتوں کے لباس دن بدن چھوٹے ہوتے جارہے ہیں اور یہ لباس عورتوں کے جسم کو ڈھکنے کے بجائے اس کے نشیب وفراز اور خال وخط کو اور نمایاں کرتے ہیں ان کی اور چغلی کھاتے ہیں۔ ان فلموں، ڈراموں اور سیریلوں کے ذریعہ قدروں کو پامال کیا جارہا ہے اور گھروں میں دیکھے جانے والے سیریلوں میں شادی سے پہلے ہی ماں بننے کے واقعات خوب دکھائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین غیر مردوں کے ساتھ گھومتی ہیں اور رات رات بھر باہر رہتی ہیں۔ بیٹی رات کا بیشتر حصہ جب کلب اور بار میں گزار کر گھر آتی ہے اور باپ باز پرس کرتا ہے تو باپ کو ہی اپنی بیٹی کا لکچر سننا پڑتا ہے۔ ماں باپ جوان بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے اور ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے رقص کرتے ہیں۔ اور یک طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کی آزادئ نسواں کے ہتھیار کے روپ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چھوٹے اور معصوم بچے یہی سمجھتے ہیں کہ مہذب اور تعلیم یافتہ سوسائٹی میں ایسے ہی رہا جاتا

ہے اور ان کا کچا ذہن ان خرافات کا بڑی تیزی سے اثر قبول کرتا ہے۔

جہاں ایک طرف ٹی وی کلچر بالخصوص نجی ٹی وی چینل اجاحیت کو فروغ دینے میں موثر رول ادا کررہے ہیں وہیں یہ کہنا پڑے گا کہ سرکاری ذرائع ابلاغ ان برائیوں سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔ دوردرشن کے پروگراموں میں قدر شائستگی ہوتی ہے اور بے شرمی و بے حیائی کو بڑھاوا دینے میں اس کا ہاتھ کم نظر آتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کی بات ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اب بھی اپنے معیار کو کسی حد تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ نجی ریڈیو کی آمد نے گرچہ ریڈیائی نشریات میں کسی حد تک کھلا پن لانے کی کوشش کی ہے تاہم آل انڈیا ریڈیو نے شرافت وشائستگی کا دامن ابھی نہیں چھوڑا ہے۔

اس طرح جب ہم ذرائع ابلاغ اور ہمارا معاشرہ کی بات کرتے ہیں تو یہ ہندو معاشرہ مسلم معاشرہ یا پھر ہندستانی معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ یہ عالمی معاشرہ ہوتا ہے گلوبل سوسائٹی ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کا دامن وسیع ہوگیا ہے اس میں تنگنائے غزل کا شکوہ نہیں بلکہ اظہار وبیان کی لامتناہی وسعت ہے۔ ان ذرائع میں انفارمیشن اور اطلاعات کے حصول کی اتنی چاہت اور تڑپ ہے کہ واشنگٹن ، نیویارک، لندن اور دبئی سے کام کرنے والے نیوز چینل ہوں یا دہلی اور ممبئی سے سرگرم میڈیا مراکز، یہ چھوٹی سی چھوٹی اطلاع بھی حاصل کرنے اور ہم تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالیشان عمارتوں اور دنیا جہان کی سہولتوں سے مزین ان مراکز کے نمائندے دور دراز کے قبائلی علاقوں تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چاند پر کمند ڈالنے کے عزائم بھی رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو تو گنیش کی مورتی کے مبینہ طور پر دودھ پینے کی خبریں نہ تو پوری دنیا سے نشر اور شائع ہوتیں اور نہ ہی حال ہی میں مریخ پر پہنچنے والی گاڑی کی پل پل کی خبریں دی جاتیں۔ انٹرنیٹ کی بات کریں تو یہ ایک ایسی عالمی شاہراہ ہے جو پوری دنیا سے گزرتی ہے اور ہمارے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں بھی پہنچتی ہے۔ چونکہ ہر چیز کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور ایک منفی۔ لہٰذا ذرائع ابلاغ میں بھی دونوں پہلو پوشیدہ ہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم کس سے متاثر ہوتے ہیں اور کس کو کس حد تک برداشت کرتے ہیں۔

تحسین منور

عوامی ذرائع ابلاغ کا مستقبل

ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے اپنی کتاب ''ابلاغیات'' کے پیش لفظ میں ولبر شرم کی پیشین گوئی سے استفادہ اٹھایا ہے۔ ولبر کہتا ہے کہ ''عوامی ذرائع ترسیل دنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔'' ولبر شرم نے یہ بات تقریباً چالیس برس قبل کہی تھی۔ آج جب ہم عوامی ذرائع ابلاغ کی انقلابی حیثیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے بلکہ دنیا کی تقدیر بھی عوامی ذرائع ابلاغ نے اپنی مٹھی میں کر لی ہے۔ اور یہی عوامی ذرائع ترسیل کا مستقبل بھی کہا جا سکتا ہے یعنی ''کرلو دنیا مٹھی میں....!!!

عوامی ذرائع ترسیل ادب کسی بھی سماج اور ملک کی ترقی کا پیمانہ بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تباہ حال افغانستان میں موبائیل فون پہنچے اور انٹرنیٹ کنکشن کی سگبگاہٹ ہوئی تو مغربی میڈیا نے اسے افغانستان کی ترقی سے تعبیر کیا۔ اطلاعات کی ترسیل کی جدید ترین تکنیک اور آلات کا استعمال آنا ترقی کا معیار بلند کرتے ہیں۔ اس سے ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ابھی کل کی ہی بات ہے کہ منادی والا ڈھول پیٹ پیٹ کر اپنے گلے کی

طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف اطلاعات گاؤں گاؤں پہنچایا کرتا تھا۔ لفظ جب کاغذ پر اترنے تو پھر اطلاعات کی ترسیل کی شکل بدلنے لگی۔ گذشتہ صدی تو یقینی طور پر پرنٹ میڈیا کے نام رہی۔ مگر آواز جب دیوار سے چھننے لگی اور آواز کے ساتھ ساتھ تصویروں نے بھی لہروں کا دامن تھامنا شروع کیا تو پھر عوامی ذرائع ابلاغ کی دنیا میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا جس نے ولبر شرم کے قول کو سچ ثابت کردیا۔ آج ٹیلی ویژن ترسیل کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ نہ صرف ترسیل بلکہ پروپیگنڈہ کا بھی زبردست ہتھیار ہے اس وقت ٹیلی ویژن جو ہر صحیح وغلط اطلاع آپ تک پہنچا رہا ہے۔

اطلاعاتی تکنالوجی کے فروغ نے عوامی ذرائع ابلاغ کا مستقبل سنوار دیا ہے۔ آج نہ صرف مختلف سماجی اور سیاسی اطلاعات کی عوام تک رسائی آسان ہوچکی ہے بلکہ مستقبل میں اقتصادی، تعلیمی ،نفسیاتی ، انتظامی ،سائنسی اور طبی شعبہ جات سے عوام کا رشتہ اس کے ذریعے حسب ضرورت مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔

اب بینک کے ساتھ براہ راست رابطے کے لئے e-banking ہے تو تجارت کی اطلاعات حاصل کرنے کے لئے e-commerce موجود ہے۔ تعلیم سے رشتہ 3-learning مضبوط کررہی ہے تو نفسیاتی بیماریوں کے سلسلے میں اور دیگر مشورے اور معلومات e-counseling سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

شادی بیاہ ، دوستی اور دیگر ملاپ سے متعلق اطلاعات کے لیے e-marriage یا e-freindship, e-dating کا رجحان بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی نہیں اب تو آپریشن اور دیگر طبی سہولیات کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال ہونے لگا ہے۔ ویڈیو کانفرنسنگ اور Call centres کو دوطرفہ آمدورفت کو یقین بنارہے ہیں۔ مختلف قومی سطح کے اخبارات اس تیز رفتار ترقی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے Internet edition تشکیل دے رہے ہیں۔ یہی نہیں ابھی کل کی ہی خبر تھی کہ دلی پولس چوری ہونے والی گاڑیوں سے متعلق معلومات آپ کو SMS کے ذریعے بھیجنے لگے گی۔ آپ کے پاسپورٹ کے لیے درخواست کس سطح پر دھول پھانک رہی ہے وہ بھی آپ کو ٹیلی

فون پر SMS کے ذریعہ پتہ چل جائے گا۔ موبائیل نے جس انداز سے آپ تک خبروں اور دیگر اطلاعات کو پہنچانا آسان بنایا ہے وہ مستقبل کا اشارہ ہی ہے۔ صبح کے اخبار کے بغیر جو لوگ پریشان ہوتے ہیں اب وہ ٹیلی فون کے ذریعہ باآسانی فارغ ہو سکتے ہیں۔

اور آخر میں اردو کے حوالے سے صرف اتنا کہنا ہے کہ جہاں تک ٹیلی ویژن سیریل اور ممبئی فلمی دنیا کا معاملہ ہے اس میں اردو زبان کی اہمیت برقرار ہے۔ مگر ادھر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ نیوز چینل بھی اردو کا دامن تھامتے دکھائی دے رہے ہیں۔ غلط تلفظ اور غلط استعمال کے باوجود نیوز چینل اردو کی ''خلافت'' ان کے انداز میں اور ہمارے لہجے میں مخالفت نہیں کر رہے۔

میرا ادنیٰ تجربہ تو اس سے بھی آگے یہ ہے کہ ایڈروٹائزنگ میڈیا یا اسٹیج شوز، ملٹی میڈیا یا Presentation, Audio visiaul ڈیمونسٹریشن وغیرہ میں بھی اردو کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ گستاخی معاف۔! مشکل بس رسم الخط کے معاملے میں آتی ہے۔ کئی بار ناچیز کے سامنے ایسے مراحل آئے ہیں جب اردو کو انگریزی یا ہندی میں لکھ کر استعمال میں لانا پڑا ہے۔ وہ چاہے ورلڈ یکتا کھی کے لئے لکھنا رہا ہو یا پھر زنکاری یا باہر دیو سنگھ جی کی فلم یا پھر این ڈی ٹی وی پر گستاخی معاف رہا ہو یا پربھیل واڑہ شوٹنگس کی کارپوریٹ فلم۔

Internet کے دوران یہ ضرورت صاف جھلکتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اردو میں سافٹ ویئر کے فروغ کے ساتھ اردو زبان میں بھی اگر یہ سہولت مہیا آجاتی ہے تو پھر اردو والوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

آخر میں صرف اتنا کہ اطلاعات کی بھرمار ہوتی جارہی ہے۔ یہ ''اطلاعاتی کثافت'' عوامی ذرائع ابلاغ کی راہ میں دشواری کھڑی کر رہی ہیں۔ جب نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی اطلاعات کی رسائی آپ تک ہو رہی ہے جس کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ ایسے میں عوام میں ذہنی اور شعوری بیداری صحیح اطلاعات کے چناؤ میں مددگار ہو سکتی

ہے۔ اس کے باوجود عوامی ذرائع ابلاغ کا مستقبل روشن ہے۔ اور جدید تکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسے چلنا ہے۔ جو اس ترقی کی رفتار سے رفتار ملانا جانتے ہیں ان کے لئے بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کے مواقع موجود ہیں۔ مستقبل قریب میں کئی نئے ٹی وی چینل شروع کئے جارہے ہیں۔ اردو کے لئے خاص طور پر E-TV اردو تو ہے ہی۔ سہارا (Sahara TV)، اور زی (Zee TV) بھی اردو چینل لارہے ہیں۔ دوبئی سے بھی کئی اردو چینل کی آمد متوقع ہے۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں کے چینل، خبروں کے چینل، FM ریڈیو کو مل رہی وسعت، چناوی فلمیں، معلوماتی CDs, VCDs وغیرہ سب ہی میڈیا کے خوش آیند مستقبل کی جانب اشارہ کررہے ہیں۔

عوامی ذرائع ابلاغ کا مستقبل تابناک ہے اور اس کے ساتھ جڑ کر مستقبل کو سنوارا جاسکتا ہے۔ آگے بڑھئے۔ میڈیا میں آپ کا خیر مقدم ہے..... ہوگی دنیا مٹھی میں...!

جی. ڈی. چندن

اردو صحافت: ماضی کے آئینے میں

اردو صحافت کی پیدائش یعنی ۱۹ویں صدی، جس کی فصیل میں یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے، ایک درخشندہ ماضی کی مالک ہے۔ یہ درخشندگی اتفاقیہ نہیں تھی بلکہ اس کے وراثتی خواص اور فطرتی اوصاف کا ثمرہ تھی۔

اسے دو بنیادی امتیازات حاصل تھے۔ پہلا یہ کہ اس کے اولین اخباروں کو ایک اچھی تعداد میں فارسی کی صدیوں پرانی قلمی صحافت کے تجربہ کار وقائع نگار یا آج کل کی اصطلاح میں نامہ نگار ملے۔ سرکاری سطح پر کام کرنے والے یہ وقائع نگار حسبِ حکم مغل سلطنت کے طول وعرض میں آزادانہ نامہ نگاری کرتے تھے۔ مارچ 1707ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یہ سرکاری ملازمت سے محروم ہوگئے۔ ان میں سے کچھ تو ضرورت مند ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ لیکن ایک اچھی تعداد نے اپنے نجی قلمی اخبار نکالے اور یہ جہاندیدہ فہم جو بیک وقت اپنے اخباروں کے ناشر، رپورٹر، ایڈیٹر اور خبر خواں ہوگئے تھے۔

گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کی کونسل کے لیجسلیٹو ممبر میکالے نے 1836ء میں

اپنے ایک نوٹ میں لکھا: ''یہ قلمی اخبار مقامی لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ دہلی میں ان کے بے شمار وقائع نگار خبروں کی فراہمی کے لیے شاہی محل، (برٹش) ریذیڈنسی اور عدالتوں کے احاطوں میں مسلسل گھومتے رہتے ہیں۔ مقامی امراء بڑی تعداد میں ان کے اخبار خریدتے ہیں جن میں ہر قسم کی افواہیں اور ہفوات درج ہوتی ہیں۔ یہ قلمی اخبار دہلی سے باہر بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہوئی لیکن جانکار حلقوں کا اندازہ ہے کہ اکیلے دہلی سے ہر روز 120 اخبار باہر بھیجے جاتے ہیں۔'' (بحوالہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: Newsletters in the orient، ص 86)

اسی موضوع پر خود گورنر جنرل نے اپنے نوٹ میں لکھا: ''ان قلمی اخباروں میں برائی اور بدخواہی، جائز اور ناجائز سے کوئی تامل نہیں کیا جاتا.... یہ شرانگیز اور (لوگوں کو) بھڑکانے والے ہوتے ہیں۔''

سرکاری اسلوب کے ان الفاظ میں پوشیدہ وقائع نگاروں کی فرنگی راج سے بیزاری آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ بالخصوص گورنر جنرل کا نوٹ مظہر ہے کہ 1857ء کی عظیم بغاوت کی زمین تیار کرنے والے یہی اخبار تھے۔

ابتدائی اردو اخباروں کا دوسرا امتیاز یہ تھا کہ 1822ء میں کلکتہ سے جاری ہونے والے اولین اخبار ''جام جہاں نما'' کا بانی ہری ہردت تارا چند دت کا بیٹا تھا جو اس زمانے کے ممتاز ترین سماجی لیڈر اور دانشور راجا رام موہن رائے کا صحافتی معاون تھا۔ ان کا خانوادہ علم و آگہی کی نئی قدروں سے واقف اور نئے سیاسی و سماجی امور سے آگاہ تھا۔ جام جہاں نما کے اجرا کے بعد 1837ء میں شمالی ہند سے نکلنے والے دوسرے ''دہلی اردو اخبار'' کا بانی مولوی محمد باقر یورپ کے علم و ادب کو فروغ دینے والے 1825ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام قائم شدہ دہلی کالج کا فارغ التحصیل تھا اور فارسی و عربی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید موضوعات سے واقف تھا۔ اس کے علاوہ وہ مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کا ارادت مند اور معاون تھا اور فرنگی راج کو مغل سلطنت کا دشمن سمجھتا تھا۔ یہ اخبار اور قلمی اخباروں کے وقائع نگار ایک ہی منزل کے ہم سفر تھے۔

اس اشتراک سے دہلی اردو اخبار سیاسی نوعیت کا وہ شعلۂ جوالہ بن گیا تھا جس کی باغیانہ رپورٹنگ کو برٹش حکام بھلا نہ سکے۔ اپنی کثیر فوجی طاقت سے 1857ء کی بغاوت کا انسداد کرنے کے بعد ان حکام نے ہاتھ آجانے والے دیگر باغیوں کے ساتھ مولوی محمد باقر کو بھی توپ کے گولوں سے شہید کر دیا۔

اس شہادت نے اردو صحافت کو جہادِ حریت کا ایک ایسا بلند مقام عطا کر دیا کہ یہ پورے ملک کے لیے جنگ آزادی کا آئینہ بن گئی۔

اس صحافت کا اجرا پہلی ملک گیر اور نمائندہ سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے 63 سال قبل ہوا اور اپنے قیام کے بیس سال بعد یہ کانگریس اس وقت انقلاب کی منزل پر پہنچی جب 1905 میں برٹش راج نے بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا۔ لیکن اردو صحافت حریت کا کلمہ پڑھتے ہوئے سینکڑوں باغیوں کے ساتھ جن میں ان کے قارئین بھی شامل تھے برطانوی توپوں سے اڈنے والا جام شہادت نوش کیا۔

روایت ہے کہ ان کے بیٹے محمد حسین آزاد نے چھپ چھپ کر یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ ان کے خلاف بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا۔ جرم یہ تھا کہ انھوں نے بھی دہلی اردو اخبار کی ادارت کی تھی اور 1857ء کی بغاوت پر ایک نظم شائع کی تھی جو دہلی کے عوام وخواص کی زبان پر ثبت ہوگئی تھی۔ اس نظم کا عنوان: ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' تھا جس سے ہماری تحریک آزادی جو اس وقت زیر تشکیل تھی، انقلاب کا مستقل نعرہ مل گیا۔ محمد حسین آزاد کی جنھوں نے بعد میں اردو زبان اور صحافت کے ادبی گوشوں کو منور کیا یہ نظم اپنی ذات ہی میں معنی خیز اور محرک خیال تھی۔

انقلاب کے اس ذوق کو فروغ دینے والا اکیلا دہلی اردو اخبار ہی نہیں تھا بلکہ اردو اور فارسی صحافت کے متعدد اخباروں کا پورا قافلہ تھا۔ اس میں اردو کی جانب سے دہلی کا صادق الاخبار، لکھنؤ کے طلسم لکھنؤ اور سحر سامری، بدایوں کا حبیب الاخبار، بریلی کا عمدۃ الاخبار اور پشاور کا مرتضائی اخبار تھے اور فارسی کے گوشے سے دہلی کا سراج الاخبار اور کلکتہ کے دوربین، گلشن نو بہار اور سلطان الاخبار شامل تھے۔

ماضی بعید میں جب کہ ہمارا سیاسی شعور ابھی کچا اور ادھورا تھا شوق حریت کا یہ بلوغ اور درجہ ایثار صرف اردو صحافت ہی کو حاصل تھا۔

اس صحافت کا ماضی تاریخی تمازت سے معمور ہے۔ اس نے 1857ء کے بعد تحریک آزادی کے نوے سال کے سفر کو قدم قدم پر انقلاب کی حرارت سے روشن اور گرم جوش کیا۔

ماضی کے اس آئینے کا یہ صرف ایک پہلو ہے جو اپنے وجود ہی میں منفرد اور جامع ہے۔ یہ اپنے دور کی سب سے عزیز قدر حب الوطنی کے لیے وقف رہا۔ لیکن یہ آئینہ صد رنگ ہے۔ اس کی زبان گوناگوں صلاحیتوں کی مالک ہے اور اس کی جامعیت کا فیض اردو صحافت کو ابتدائی زمانے ہی سے حاصل رہا گو یہ نت نئی مشکلات سے دوچار رہی۔

سیاسی رنگ کے ساتھ جلد ہی اس نے گلدستوں کی صحافت کے کمالات دکھائے۔ اس کی ابتدا دہلی اردو اخبار کے اجرا کے اگلے ہی دہے میں 1845ء میں ہوئی۔ یہ ابتدا دہلی کالج ہی کے ایک فارغ التحصیل مولوی کریم الدین نے ''گل رعنا'' کے اجرا سے کی اور اس اجرا کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے اردو کے ایک سو سے زیادہ گلدستے جاری ہوئے۔ یہ اس دور کے مشاعروں اور شعرا کے احوال کا نہایت قیمتی مآخذ ہیں اور اردو زبان کی ادبی اور ثقافتی وراثت کا سدا بہار بشرہ ہیں۔

متذکرہ دو پہلوؤں کا افتخار اور حسن اس قدر دلکش ہے کہ بعض لوگ اردو صحافت کو انھیں دو خانوں میں بانٹ کر اس کے ادراک سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ماضی کا یہ آئینہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے صد رنگ ہے اور ایک ہی وقت میں کئی کئی رنگ بھی دکھا سکتا ہے۔ 1845 میں یعنی گل رعنا کے اجرا کے سال ہی میں دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر کے زیر اہتمام قران السعدین اور اس کالج کے ایک استاد ماسٹر رام چندر کی زیر ادارت فوائد الناظرین کے ناموں سے دو رسالے جاری ہوئے۔ پھر دو ہی سال بعد ماسٹر رام چندر نے ایک اور رسالہ ''محبّ ہند'' کے نام سے جاری کیا جو سب کے سب

اردو کی ابتدائی صحافت کے علمی پہلو کی عظمت کو نمایاں کرتے تھے۔ اس دور میں اردو ناشروں میں اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ قران السعدین کے اجرا کے بعد اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکلے۔ ان سب کے نام ہمیں معلوم نہیں کیونکہ بدقسمتی سے اردو صحافت کے ریکارڈ کی یکجائی اور حفاظت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی لیکن علمی رسالوں کے بارے میں یہ بیان دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر کا ہے اور اس کی صداقت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

اس ابتدائی زمانے میں ہمارے ایک علمی رسالے کا معیار کیا تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماسٹر رام چندر کے فوائد الناظرین میں پہلے پانچ سال میں کل 179 مضامین شائع ہوئے جن میں سے 110 سائنس، تاریخ یا سائنس کے موضوعات پر تھے۔

فوائد الناظرین کے ایک ہی سال بعد دہلی سے ہفتہ وار فوائد الشائقین جاری ہوا جس کے مہتمم پربھودیال تھے۔ یہ اخبار قانون کے امور پر واقف تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے نئے قوانین کی وضاحت کیا کرتا تھا۔

یہ اردو صحافت کا دور اول تھا۔ اس میں اخباروں کی مجموعی تعداد تو بہت زیادہ نہیں تھی لیکن یہ تنوع میں غریب نہیں تھی۔ اس کے سیاسی اخباروں کی آنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فرنگی حکومت برداشت نہ کرسکی اور اس نے 1857 کی بغاوت کو کچلنے کے بعد اس کی آئندہ روک تھام کے لیے ہر مشتبہ طبقے پر انتقامی مظالم بپا کیے۔ اس کارروائی کے متاثرین میں اردو صحافت سرفہرست تھی۔ ہسٹری آف انڈین جرنلزم میں جے نٹ راجن نے لکھا ہے کہ 1853 کی سرکاری فہرستوں میں 35 دیسی اخباروں کے نام تھے۔ بغاوت کے بعد 1858 میں یہ تعداد صرف 12 رہ گئی۔ ان 12 میں صرف ایک اخبار ایسا تھا جس کا ایڈیٹر ایک مسلمان تھا۔

سامراجی عمل کے تحت ایک ہونہار صنف کا یہ انجام رنجدہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ 1857 کے بعد قوت حیات کے غنی اردو پریس کا نیا جنم ہوا اور یہ اس کا دوسرا دور تھا جو

صدی کے آخر تک جاری رہا۔ اس دور میں اردو اخبارات عام طور پر محتاط ہو گئے لیکن انھوں نے وطن دوستی اور قومی تہذیب کے نظریوں کو برطرف نہ کیا۔ اپنی تمام احتیاط کے باوجود بدیشی راج کو بدیشی راج ہی مانتے رہے۔ اور اسکی علامت کے لیے اپنے ذہن اور قلم کے تجربے کرتے رہے۔ اسی عمل میں 1877 میں لکھنؤ سے ایک نئے اخبار اودھ پنچ کا اجرا ہوا تو گویا یہ تجربے بار آور ہو گئے۔ اس اخبار نے طنز ومزاح کو فرنگی راج کی ناگواریوں کی مذمت کا ذریعہ بنایا۔ اس سے اردو پریس کو حب الوطنی کی پیروی کی ایک پسندیدہ نئی راہ مل گئی۔ مزاح کے پردے میں جرأت اور دلیری کا اظہار خاطر خواہ سلامتی سے ہوسکتا ہے۔ اودھ پنچ نے اسی طریقے کے امکانات کو روشن کیا۔ اس کے بانی منشی سجاد حسین نے جو ایک اچھے صاحب علم اور صاحب قلم تھے، بدیشی راج اور اس کے ساتھ آنے والی مغربی تہذیب کے مضحک پہلوؤں کو طنز ومزاح کے حربے سے نمایاں کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار کا تصور لندن پنچ سے لیا تھا جو اہل سیاست اور ان کی سیاست کے مدوجزر پر کارٹون شائع کرتا تھا۔ اودھ پنچ نے بھی کارٹون کو اپنے اخبار کا خاص حصہ بنایا۔ سیاسی اور سماجی کرداروں کا خاکہ اڑانے اور ان میں لولو بنانے کا یہ نیا انداز بہت مقبول ہوا۔ دراصل اودھ پنچ کا سارا انداز اور اسلوب ہی اردو صحافت کے ایک نئے باب کا نقیب ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول وعرض سے قریباً ساٹھ نئے اخبار جاری ہو گئے جنھوں نے نئے نئے زاویوں سے طنز ومزاح کی صحافت کو فروغ دیا۔

قومی فرض کی مقبولیت اور اس کی ادائیگی کے لیے موثر طریقوں کی تلاش اور دریافت ماضی کی اردو صحافت کا خاص پہلو رہا ہے۔ ہمارے صحافیوں نے ہر اہم موقع اور موضوع پر توجہ دی اور اس کی بارآوری کے لیے اپنے کالموں کو وقف کیا۔ ۱۹ ویں صدی کی اردو صحافت کے دوسرے دور میں یہ کاوش اور بھی زیادہ نتیجہ خیز رہی جس سے اس کی صلاحیت اور افادیت کا شہرہ ہوا۔ اگرچہ ابتدا میں فرنگی راج دیسی اخباروں سے خائف اور ان کے اجرا اور عمل پر پابندیاں عائد کرتا رہا لیکن رفتہ رفتہ اسے ان کی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے نظام کی قبولیت اور ایک سازگار ماحول کے لیے

اخبار مفید کام کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے اجرا اور منتخبہ اخباروں کی سر پرستی میں دلچسپی لینے لگا۔ پنجاب میں سکھ راج پر حاوی ہونے کے بعد کمپنی کی حکومت نے پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن قائم کیا اور پھر اس بورڈ کے تحت اپنے تعارف اور وقار کے لیے ایک اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جنوری 1850 میں لاہور سے ہفت روزہ ''کوہ نور'' کا اجرا ہوا۔ یہ کلیتاً ایک سرکاری اخبار تھا اس کا مقصد عوام میں برٹش گورنمنٹ سے پنجاب کے الحاق کو مقبول اور موقر بنانا تھا۔ لیکن اس کے ایڈیٹر ہر سکھ رائے نے صحافت کے اصولوں اور اردو پریس کی ساکھ کو نظر انداز نہ کیا۔ وہ آزادئ صحافت پر گہرا یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ جب لیجسلٹو کونسل میں صحافت کو پابند کرنے کی تجویز پر غور شروع ہوا تو اس سرکاری اخبار نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اخبارات کو اس کے خلاف متحد ہو جانے کی بھی صلاح دی۔ اس نے لکھا:

> ''سب کو لازم ہے کہ یک دل اور یک رائے ہو کر بہ کمال مستعدی پیروی اس امر کی کریں کہ ایسا قانون جاری نہ ہووے، ورنہ سب کو ضرر ہے اور پھر اخبار اور چھاپے کی کچھ ہستی نہ رہے گی۔''

اس اخبار کے منیجر منشی نول جنھوں نے 1857 کے انتشار کے بعد لکھنؤ جا کر 1858 میں اودھ اخبار جاری کیا جو ان کی خوش انتظامی سے اس صدی کا سب سے بڑا اردو اخبار بن گیا۔ یہ ایک نجی اخبار تھا جو اپنے تاجر مالک کے حکومت نواز رویے کی وجہ سے سرکاری کوہ نور کی طرح آزادئ صحافت کی دوٹوک حمایت نہ کر سکا۔ بہر حال اس نے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو سربلند کیا۔ فرقہ وارانہ معاملات کو متوازن رخ دیا اور اردو اور ہندی کی تکرار میں اردو کی حمایت کی۔

اس اخبار کے پڑھنے والوں اور مداحوں میں اس دور کے ممتاز ریفارمر اور دانشور سر سید احمد خاں بہت نمایاں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ معاشرے کی اصلاح اور تعمیر کے لیے صحافت بڑی باصلاحیت صنف ہے۔ وہ ایک پیدائشی مشنری تھے۔

اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے موثر تدبیریں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے صحافت میں داخل ہونے سے پہلے 1864 میں سائنٹی فک سوسائٹی کے نام سے ایک علمی انجمن قائم کی جس کا مقصد مشرق اور مغرب کے علوم وفنون کا ادراک اور فروغ تھا۔ سوسائٹی کو متانت کی جدید قدروں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بتایا گیا کہ

''اس کو کسی مذہبی کتابوں سے سروکار نہ ہوگا۔''

اس سوسائٹی نے اپنے ابتدائی نو سال میں سائنس، ریاضیات، معاشیات، تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر 15 اردو کتابیں شائع کیں۔ لیکن یہ سرسید کے اگلے اہم تر کارنامے کی سیڑھی تھی۔ سوسائٹی کے قیام کے دو ہی سال بعد 1866 میں انھوں نے ''اخبار سائنٹی فک سوسائٹی'' یا علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا۔ یہ انگریزی اور اردو دو زبانوں میں تھا جس سے نئی انگریزی حکومت اور ہندستانیوں کے درمیان ذہنی رابطے کے امکانات کو روشن کرنے کی تدبیر کی گئی۔ اس اخبار کے اجرا کے لیے سرسید نے ایک الگ سوسائٹی قائم کی جس کے ممبروں میں مسلمان، ہندو اور انگریز شامل تھے۔ ۱۹ ویں صدی کے تیسرے ربع میں یہ اشتراک سیکولر اور جمہوری طرز فکر کا نمایاں اظہار تھا اور سرسید کے وطن ساز نظریوں اور ارمانوں کا ترجمان تھا۔ قریباً گیارہ برس تک اس اخبار کے سرورق پر انگریزی اور اردو میں مندرجہ ذیل موٹو (نصب العین) چھپتا رہا:

''جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ
کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت
کا۔''

اس اخبار نے ایک طرف تو سرسید کی تعلیمی مہم کو مضبوط اور تیز گام کیا اور دوسری طرف بلالحاظ مذہب وملت کے عوام کے ذہنی افق کو حریت اور جمہوریت کی طرف مائل کیا۔ اس کی ایک اور اہم بات یہ تھی کہ اس نے اپنے کالم مخالفانہ خیالات کے لیے کبھی بند نہ کیے۔

۱۹ویں صدی کے آئینے کا یہ رنگ بھی قابل توجہ ہے۔ عام طور پر سرسید

احمد خاں کو ایک مولوی اور مسلم پسند لیڈر تصور کیا جاتا ہے لیکن ان کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے جو مسلسل 32 سال تک جاری رہا اور بقول مولانا حسین حالی کے لیڈنگ آرٹیکل سرسید خود لکھتے رہے۔ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کے پورے سماج کی ترقی اور سربلندی کے خواہاں تھے۔

یہ اخبار پریس کی آزادی کا حامی تھا۔ 1876 میں جب برطانوی پارلمنٹ میں دیسی اخبار پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو گزٹ نے، جو سرسید کے زیر اثر حکومت کا خیر خواہ تھا، ایک طویل اداریہ شائع کیا جس کا عنوان تھا: ''ہندستانی ہونا بھی ایک جرم ہے۔'' اخبار نے حکومت کے ہندستانیوں اور انگریزوں کو یکساں حقوق نہ دینے کی سخت مذمت کی اور لکھا:

> ''اگر یہ مطالبہ دیسی اخباروں کی جانب سے حکومت پر تنقید کرنے کی وجہ سے کیا گیا ہے تو یورپین اخبارنویسی کہیں زیادہ سخت اور گستاخانہ تحریریں حکومت اور گورنر جنرل کی نسبت لکھتے ہیں لیکن یہ انھیں استحقاق محض اس بناپر حاصل ہے کہ وہ انگریز ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔''

اسی اخبار میں سرسید نے اخبارنویسیوں کی ذمہ داریوں کو وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> ''ایک معزز اخبارنویس کا یہ کام ہے کہ وہ گورنمنٹ کی تدابیر کی نسبت معقول طور پر نکتہ چینی کر کے نیک صلاح دے اور مختلف معاملات کا ذکر کر کے عوام کی تربیت کرے اور لوگوں کی رایوں میں ایک عمدہ اتفاق پیدا کرے، ان خرابیوں کو ختم کرے جو ان کی حالت معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔''

ایک جہاندیدہ اور پختہ کار مدیر کی طرف سے معاشرت کی بہتری کے لیے

لوگوں کی رایوں میں عمدہ اتفاق پیدا کرنے کا مشورہ آج بھی حائل ہے اور ہمارا ماضی کا یہ آئینہ دور بہ دور اپنی شفافیت اور افادیت کا مظہر ہے۔

صحافت کا یہ نظریہ اسی ابلاغ عامہ کا ایک زاویہ ہے جس کی تلقین صحافت کے آج کے دانشور کرتے ہیں اور اس سیمینار کے ذریعے بھی یہی کوشش کی جارہی ہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے زمانے میں اس صدی کی اردو صحافت میں ایک اعتماد آ چکا تھا اور وہ مسائل حاضرہ پر کھل کر اظہار خیال کرنے لگی تھی۔ اس دور کے متعدد اور دیگر اخبار عالم (میرٹھ)، اخبار عام (لاہور)، پنجابی اخبار (لاہور)، ہندوستانی (لکھنؤ) اور دیگر 1857 کے فوراً بعد کی خوف کی نفسیات پر عبور پا چکے تھے۔ سیمینار کے ایک قلیل المدت مقالے میں ان سب کے اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں۔

بہر حال یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ماضی میں ہمارے صحافی مشکلات اور پابندیوں کے باوجود مہم جو اور تجربہ پسند رہے ہیں۔ آج ہم بالعموم ان کے حوالوں ہی سے پدرم سلطان بود کی روایت سے کام لے رہے ہیں اور اس طرح ماضی کا یہ آئینہ دھندلا ہو رہا ہے۔ آئینے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی آب وتاب کو نئی ہمت اور نئی تدبیروں سے برقرار رکھا جائے۔ یہ آئینہ آج بھی رہبر شعائیں بانٹ رہا ہے۔ انھیں وصول کرنا نئی نسل کا کام ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے اہل علم اور محقق ماضی کے سرمایے پر خاطر خواہ توجہ ہی نہیں دے رہے ہیں۔ میں یہاں صرف متذکرہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہی کی مثال دیتا ہوں۔ میری اطلاع کے مطابق اس کا 32 سال کا مکمل ریکارڈ علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس پر آج تک مفصل کام نہیں ہوا ہے گو اس کے کئی گوشے آج کی ابلاغی ضرورتوں سے ہم کنار ہیں۔

معصوم مرادآبادی

اردو زبان کے فروغ میں صحافت کا حصہ

کسی بھی زبان کے فروغ میں یوں تو کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں لیکن زبان کی ترویج واشاعت یا اسے عوامی سطح پر مقبول بنانے میں ذرائع ابلاغ کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں جب ہم اردو زبان کی ترویج اور اشاعت کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں صحافت کا کردار سب سے زیادہ روشن اور تابندہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ ادبی حلقوں میں صحافیوں کو آج بھی دوئم درجے کی مخلوق سمجھنے اور ان کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کا رجحان عام ہے لیکن اردو اخبارات اور صحافیوں نے نامساعد حالات میں بھی زندہ رہنے کا ہنر اپنے اسلاف سے سیکھا ہے اس کے تحت نہ صرف اردو صحافت زندہ ہے بلکہ وہ زبان کے فروغ میں بھی دوسروں سے کئی گنا زیادہ کردار ادا کر رہی ہے۔

اس ملک میں اردو صحافت کی تاریخ تقریباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو نثر کی تاریخ۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو نثر کو اصل بال و پر اردو صحافت نے ہی عطا کیے ہیں۔ 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج سے اردو نثر کا آغاز ہوا اور اس کے

۲۰ سال بعد کلکتہ سے ہی اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' منظر عام پر آیا، جس نے اردو نثر کو پہلی مرتبہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ فورٹ ولیم کالج نے جن فارسی اور سنسکرت مخطوطات کو اردو میں منتقل کر کے شائع کیا وہ عوامی مقبولیت کی چیزیں نہیں تھیں۔ اس لیے ''جامِ جہاں نما'' کی اشاعت کے بعد ہی عوام میں اردو نثر کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ اردو زبان ہمیشہ صحافت کے شانے پر زندہ رہی ہے اور ان ہی ادیبوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، جنھوں نے اخبارات کے ذریعہ عوام سے مکالمہ قائم کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، علامہ نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی اور محمد طفیل جیسے مایہ ناز انشاء پرداز دراصل صحافت ہی کا اصل سرمایہ ہیں جس پر ادب نے اپنا قبضہ جمالیا ہے۔

ہمارے ادیبوں اور نقادوں کا صحافت پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ صحافتی تحریروں کو دوام حاصل نہیں ہے اس لیے ان کی ادبی حیثیت کا تعین تقریباً ناممکن ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہر زمانے کی صحافت اپنے دور کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت بھی کیا جاسکتا ہے کہ ماضی کی بہت سی صحافیانہ تحریریں آج ہمارے ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ خود الہلال اور البلاغ کے لیے لکھی گئی مولانا آزاد کی بہت سی تحریریں اکثر وقتی اور ہنگامی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کی ادبی حیثیت آج بھی مسلّم ہے۔

ادبی تحریکوں میں ترقی پسند تحریک کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے جو سب سے طاقتور تحریک تھی۔ اس تحریک کا ایک حصہ اخباری تحریروں کی دوسری شکل معلوم ہوتا ہے لیکن ادب کے نقادوں نے آج تک انھیں اس الزام پر ادب سے خارج کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ آج اگر ہندستان میں نامساعد حالات کے باوجود اردو زندہ ہے تو اس کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے کا سہرا صرف اردو صحافت کے سر ہی باندھا جاسکتا ہے۔ آج اردو زبان کو عوامی سطح پر فروغ دینے میں اخبارات و رسائل کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ملک کے وہ تمام

سرکاری و نیم سرکاری ادارے جن کے کاندھوں پر زبان کا فروغ یا اس کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری ہے وہ اردو اخبارات اور رسائل کی طرف ٹیڑھی ترچھی نگاہ رکھتے ہیں۔ اردو اکادمیوں، انجمنوں اور کونسلوں کا سارا کا سارا بجٹ ایسی ریسرچ اور کتابوں کی نذر ہو جاتا ہے جن کے پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد پورے ملک میں ہزار دو ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ کتابیں ایسے موضوعات سے متعلق ہوتی ہیں، جن کا اردو کے عام قاری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ اب تو ایسے موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں جن کا اردو ادب تہذیب یا زبان کے فروغ دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ نہ صرف ان کتابوں کے عنوانات اور اصطلاحات غیر مانوس ہوتی ہیں بلکہ اکثر اوقات ان کی اشاعت کا مقصد بھی واضح نہیں ہو پاتا ہے۔

اس کے برعکس ملک کے چند بڑے شہروں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا مجموعی سرکولیشن لاکھوں میں ہے ان میں وہ ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ رسائل و جرائد بھی شامل ہیں جو پورے ملک کی اردو داں آبادی میں قدر و منزلت کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں اور ان کے مستقل قارئین بے چینی سے ان کا انتظار کرتے ہیں۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں جب اردو دنیا کے مقبول ترین فلمی و ادبی رسالے ''شمع'' کی اشاعت ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی، اگرچہ اس کی اشاعت بعض خانگی وجوہ کی بنا پر بند ہو گئی ہے لیکن آج بھی یہ رسالہ اسی آب و تاب سے منظر عام پر آئے تو اس کا اردو عوام میں ویسا ہی خیر مقدم کیا جائے گا۔

پریس رجسٹرار کی گذشتہ رپورٹ کے مطابق پورے ملک سے شائع ہونے والے تقریباً 2 ہزار 844 اردو اخبارات و جرائد کا مجموعی سرکولیشن 61 لاکھ سے زائد ہے۔ اپنی تعداد کے لحاظ سے اردو صحافت ملک کی 22 بڑی زبانوں کی صحافت میں ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرے نمبر پر ہے اور سرکولیشن کے اعتبار سے ہندی، انگریزی اور ملیالم کے بعد اس کا چوتھا نمبر ہے۔ ان اعداد کے اعتبار سے گذشتہ دہوں میں اردو اخباروں

نے تعداد کے لحاظ سے ساڑھے پانچ گنا اور سرکولیشن کے لحاظ سے تقریباً آٹھ گنا اضافہ حاصل کیا ہے۔

اگر صرف اردو روزناموں پر نظر ڈالیں تو پورے ملک سے 525 اردو روزنامے شائع ہوتے ہیں یہ ملک کی دیگر زبانوں کے گوشوارے میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ان روزناموں کا مجموعی سرکولیشن 36 لاکھ 14 ہزار 692 بتایا گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آج ملک کے کم از کم 36 لاکھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہر صبح اردو کا ایک اخبار ہوتا ہے۔ اگر آپ ان سرکاری اعداد وشمار کو مبالغہ آرائی بھی کہہ لیں تو اس حقیقت سے نظریں چرانا مشکل ہے کہ دہلی، کلکتہ، پٹنہ، حیدرآباد، بنگلور اور ممبئی سے شائع ہونے والے دس بڑے اخباروں کا مجموعی سرکولیشن ہی کم وبیش 3 لاکھ ہے۔ ایک معتبر سروے کے مطابق ایک اردو اخبار گھر کے افراد اور آس پڑوس کی لین دین میں تقریباً 15 ہاتھوں سے گزرتا ہے یعنی ان چند بڑے شہروں میں ہی اردو اخبارات کے لگ بھگ 45 لاکھ قارئین موجود ہیں۔

اس کے برعکس ہم اس کڑوی حقیقت کو بھی تسلیم کرلیں کہ اردو کی ادبی کتابوں کے قارئین کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جارہی ہے۔ اگرچہ یہ سچائی ہے کہ کتابوں کے قارئین ہمیشہ اخباری قارئین سے مختلف اور مختصر ہوتے ہیں لیکن آپ اس فرق کو بھی ملاحظہ کرلیں۔ اردو کتابوں کے ایک مصروف پبلشرز نے اردو کی کتابوں کی سمٹتی ہوئی مارکیٹ کی تکلیف دہ صورت حال پیش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے اردو کی ادبی کتابوں کا ایڈیشن 1100 کتابوں پر مشتمل ہوتا تھا جو بعد کو گھٹ کر 600 کتابوں کا ہوا اور اب محض 400 کاپیاں ہی چھاپی جاتی ہیں بلکہ بعض پبلشروں نے تو یہ تعداد اب 200 تک کردی ہے جس میں سے 100 کتابیں خود صاحب کتاب کو خریدنی پڑتی ہیں۔ اگر اردو اکادمیاں ادبی مسودات اور تحقیقی مقالوں پر اشاعتی امداد دینا بند کردیں تو یقیناً اردو کی ادبی کتابوں کی اشاعت بند ہوجائے گی کیونکہ ان کتابوں کی بازار میں کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی۔ ادب کی ترسیل اور اشاعت کی اس افسوس ناک صورت حال کے مقابلے

میں اگر آپ اخبارات کے پھیلاؤ اور مقبولیت پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ آج بھی عوامی سطح پر صحافت کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ ادب کے حصہ میں نہیں آتی۔ اس صورت حال پر ہمارے ادیبوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

گھر گھر پہنچنے والے یہ اخبارات جرائد ہی دراصل حروف شناسی کا وسیلہ بھی ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ بیشتر گھرانوں میں جہاں اردو اخبارات وجرائد آتے ہیں وہ بچوں کے لئے حروف شناسی کا سب سے کارگر ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت اردو زبان میں ہر موضوع پر رسائل وجرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں مذہبی، سیاسی، طبی، سماجی، علمی، ادبی، جاسوسی، تکنیکی، انفارمیشن تکنالوجی جیسے موضوعات پر سینکڑوں جرائد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اردو صحافت فرسودہ مضامین کے حصار میں قید ہے بلکہ بہت سے جدید اور عصری موضوعات پر بھی اردو میں رسائل وجرائد کی اشاعت ہو رہی ہے۔ جس سے زبان کے فروغ میں کافی مدد مل رہی ہے۔

زبان کو فروغ دینے کے سلسلے میں اردو صحافت نے جدید تکنالوجی سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ملک کے تمام بڑے اور درمیانہ درجے کے اخبارات آج کمپیوٹر کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ اردو کے کئی بڑے اخبارات کی اپنی ویب سائٹس ہیں۔ آپ اپنے کمپیوٹر ملک کے تمام بڑے اخبارات کے مشمولات انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ سکتے ہیں اور اس کا پرنٹ نکال کر محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں۔ اردو اخبارات اردو کے طالب علموں کے لیے روزگار کا بھی ایک کارآمد وسیلہ ہیں۔ مختلف یونی ورسٹیوں کے اردو طلبا آج اردو اخبارات وجرائد میں اپنی قسمت آزمارہے ہیں۔

بات صرف اخبارات اور رسائل کی مقبولیت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آج جب کہ اردو کی ادبی دنیا چند شعبہ ہائے اردو اور ادبی سمیناروں میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور کسی بھی ادبی حلقے سے اردو زبان کے فروغ واشاعت کی کوئی تحریک نہیں چل رہی ہے ایسے میں صرف اردو اخبارات ہی اردو تحریک کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے اردو اخبار ورسائل میں اردو تحریک کے حق

میں مضامین اور مراسلوں کی خاصی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے۔ ان اخبارات کے ذریعہ اردو کے لیے لوگوں میں بیداری پیدا کی جاتی ہے۔

گذشتہ دنوں مہاراشٹر میں اس وقت ایک ہلچل مچ گئی تھی جب وہاں اردو میڈیم اسکول کے دو طالب علموں نے ایس ایس سی کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کامیابی کے پس پشت ممبئی کے ایک اردو روزنامہ کی طرف سے چلائی گئی وہ مہم تھی جس میں طلبا کو اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت اور افادیت کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ اس اخبار نے ان دونوں طالب علموں کو پورے مہاراشٹر کی اردو برادری کا ہیرو بنا دیا تھا اور وہاں اردو کے تعلق سے ایک انوکھی بیداری پیدا کردی تھی۔ اردو والوں نے ان طالب علموں کو ساتھ لے کر وہاں ایک بڑا جلوس بھی نکالا تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ قومی اردو کونسل نے حال ہی میں اردو اخبارات کی طرف توجہ دی اور وہ خبر رساں ایجنسی یو این آئی کی اردو سروس کو اردو روزناموں کے واجبات کا پچاس فیصد حصہ ادا کرتی ہے جس سے اردو اخبار کا بوجھ کچھ کم ہوا ہے۔ اس کے بعد دوسرا ٹھوس قدم دہلی اردو اکادمی نے حال ہی میں اٹھایا ہے جس نے اپنے نئے وائس چیرمین جناب م افضل کی تحریک پر اردو اخبارات کو جاری ہونے والے اشتہارات کا بجٹ پچاس ہزار سے بڑھا کر 20 لاکھ روپے کردیا ہے اور 10 لاکھ روپے کی رقم الیکٹرانک میڈیا میں اردو کی ترویج کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ قومی اردو کونسل اور دہلی اردو اکادمی کے یہ اقدامات اردو اخبارات پر کوئی احسان نہیں بلکہ ان اداروں کی فرض شناسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ آزادی کے بعد سے اب تک مختلف سطحوں پر اردو صحافت اور اردو صحافیوں کو نظر انداز کرنے اور انھیں بنیادی حقوق سے محروم رکھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں یہ اس کے ازالہ کی ایک کوشش ہے۔

اردو زبان کے فروغ میں اردو صحافت کے اتنے اہم کردار کو فراموش کرکے اگر بعض ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ اردو اخبار ایک گھنٹے میں دم توڑ دیتا ہے اور ان کے

ادبی فن پارے کی عمر ایک صدی پر محیط ہوتی ہے تو ایک ایسی بیمار سوچ ہے جس کے علاج کے لیے اردو اکادمیوں کو اپنے بجٹ کی کچھ رقم ضرور مخصوص کرنی چاہیے تاکہ اردو زبان کی ہمہ جہت فروغ میں حائل اس بیماری کا مستقل علاج کرایا جاسکے۔

ڈاکٹر مظفر

دکن میں اردو صحافت کا دستورِ عمل

تلخیص

دکن کے کامیاب اخبار ورسائل کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کامیاب صحافت کے پیچھے تین عنصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اولاً مدیر کی ان تھک محنت اور لگن ثانیاً عصری آگہی اور ثالثاً ذوق قارئین کی پرکھ۔ جس اخبار یا رسالہ نے صحافت کے ان تین اصولوں پر عمل آوری کی اس نے دنیائے صحافت میں نام کمایا اور جس نے ان زریں اصلوں سے چشم پوشی کی اس نے ایک سال سے بھی کم مدت میں دم توڑ دیا اور قصر گم نامی میں کھوگیا۔ اس مقالہ میں صوبۂ مدراس اور ریاست حیدر آباد کی اردو صحافت کے حوالہ سے مذکورہ تین اصولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ چوں کہ آزادی ہند سے قبل ان اصولوں کی بہترین مثالیں ہمیں ملتی ہیں اس لیے ہم نے اس مقالہ کو دکن میں آغاز صحافت سے لے کر آزادی ہند تک محدود کیا ہے۔

تعارف

دکن میں اردو صحافت کا آغاز مدراس سے ہوتا ہے 1841 میں صوبۂ مدراس

سے جامع الاخبار نکلتا ہے اور اس کی تقلید میں اس دہائی کے ختم ہونے تک 8 اور اخبار جاری ہوجاتے ہیں۔ بہ قول پروفیسر صفی اللہ کے یہ تمام اخبارات نہ صرف مدراس میں کافی مقبول تھے بلکہ یہ دہلی، رام پور، اور آگرہ جیسے دور دراز مقامات پر بھی جاتے تھے۔ (تامل ناڈو میں اردو صحافت ،ص ۴۴) 1850 سے 1900 تک کم وبیش 20 اور اخبارات ورسائل جاری ہوتے ہیں جن میں بعض کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ طلسم حیرت مدراس (1856) اور شمس الاخبار (1859) نے 50 سال سے زیادہ عمر پائی۔ ان کے علاوہ جریدہ روزگار (1875) میں ایک ایسا رسالہ تھا جس نے نصف صدی تک اپنی مقبولیت کو قائم رکھا۔ مظہر العجائب (1879) اور قومی رپورٹ (1914) نے بیسویں صدی کے آغاز میں کافی شہرت حاصل کی تھی۔ شمس الاخبار کو پہلا روزنامہ ہونے کا شرف حاصل ہے (صفی اللہ، ص ۵۲)۔ شروع میں اخباروں کی اشاعت سیال حالت میں تھی۔ عموماً ان کی مدت اشاعت طے نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا کبھی کوئی ماہ نامہ، ہفتہ وار بن جاتا اور کوئی ہفتہ وار یا عشرہ وار روزنامہ بن جاتا اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا۔ جریدۂ روزگار کبھی ہفتہ میں ایک بار کبھی دو دن میں ایک بار چھپا کرتا تھا۔ تاہم جنگ کے دوران یہ روزانہ چھپنے لگا تھا۔ مدراس کا دوسرا روزنامہ اتفاق (1883) میں ہفتہ میں دوبار چھپتا تھا بعد میں روزانہ چھپنے لگا تھا۔ قومی رپورٹ (1914) کی اجراء ماہ نامہ کی شکل میں ہوئی تھی تاہم چار سال کے بعد 1918 میں یہ روزنامہ ہوگیا۔ چھپائی کے دنوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ مخبر دکن (1859) پہلے پنج شنبہ کو چھپتا تھا بعد میں چہار شنبہ کو چھپتا تھا (ملاحظہ تامل ناڈو میں اردو صحافت ،ص ۵۵-۷۳) صوبۂ مدراس کے بعض اخباروں میں معاصرانہ چشمکیں چلتی تھیں جو ان کے صحت مند مقابلہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نیز اس سے عوام کی دل چسپی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً نیر اعظم (1864) اور اخبار صبح صادق (1855) مخبر دکن (1895) اور جریدۂ روزگار (1875) المعی (1929) اور آزاد ہند (1932) کے درمیان خوب معرکے ہوا کرتے تھے۔ کبھی تلخی بھی پیدا ہوجاتی تھی۔ بعض اوقات مسلمانوں کے آپسی اختلافات بھی طشت از بام ہو

جاتے تھے۔ صوبۂ مدراس میں جس جوش وخروش سے اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا اتنی ہی سرد مہری کے ساتھ ختم بھی ہوگیا۔ 1890 سے 1900 تک اس کا عروج کا زمانہ تھا۔ 1900 کے بعد یہ آہستہ آہستہ رو بہ زوال ہوجاتا ہے۔ اور 1947 کے پہنچتے پہنچتے چند ایک اخبار ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ روزنامہ مسلمان ہی ایک ایسا اخبار ہے جو 1929 سے لے کر آج تک نکلتا ہے۔

ادھر حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز 1855 ''رسالہ طبابت حیدرآباد'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ یہاں صوبۂ مدراس کے برعکس حالت پائی جاتی ہے۔ 1855 سے 1899 تک حیدرآباد سے صرف 19 رسالہ نکلے اور 14 گلدستے ہیں جبکہ مدراس میں 28 اخبارات ورسائل اور چند ایک گلدستے شائع ہوتے ہیں۔ 1900 سے 1944 تک حیدرآباد سے 135 رسائل واخبارات اور صرف 6 گلدستے نکلے ہیں جبکہ مدراس میں اخبارات ورسائل کی تعداد کافی حد تک گھٹ جاتی ہے۔ حیدرآباد میں دو ایک اخباروں کو چھوڑ کر باقی اخباروں کی اشاعت کی مدت مدراس کی طرح سیال حالت میں نہیں تھی۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کے اس استحکام کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ یہاں کے پہلے رسالہ ''رسالہ طبابت حیدرآباد'' نے ایک سنجیدہ موضوع یعنی طب کا انتخاب کر کے حیدرآباد میں اردو صحافت کے روشن مستقبل کی بنا ڈال دی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے بیشتر رسائل کسی ایک مخصوص سنجیدہ موضوع کے لیے مختص ہیں۔ طب، ادب، فلسفہ، سیاست، مذہب، فوج، قانون، تجارت، زراعت، ورزش حتیٰ کہ اسکاوٹ اور ترک سکرات کے لیے بھی ایک الگ رسالہ نکلتا تھا اور ہر رسالہ اپنے اپنے تحقیقی میدان میں مصروف کار دکھائی دیتا تھا۔ بایں وجہ یہاں مدراس کی طرح معاصرانہ چشمکوں کی گنجائش نہیں تھی۔ ہر چند حیدرآباد میں مدراس کے مقابلہ میں چودہ (14) سال تاخیر سے اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے مگر وہ آہستہ آہستہ ترقی کی راہ پر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ 1947 تک وہ مدراس کو کافی پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ آیئے دکن میں اردو صحافت کے عروج وزوال (1947 تک) کے اسباب وعلل دریافت کرنے کے

لیے سب سے پہلے وہاں کے مدیروں کی ان تھک محنتوں کا جائزہ لیں۔

دکن میں اردو صحافت کی کامیابی کا انحصار اس وقت کے ان مدیروں پر ہے جنھوں نے اپنے بے پناہ خلوص اور بے غرض لگن کا ثبوت دیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کے نام اور ان کے کام محتاج تعارف نہیں ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار (آصفی 1897) عبدالقادر سروری (مجلہ مکتبہ 1928) مولوی عبدالحق (اردو 1921) سید محی الدین قادری زور (مجلہ عثمانیہ 1927) سید شمس اللہ قادری (تاریخ 1929) قاضی عبدالغفار (نیا دور 1944 اور نیا زمانہ 1947) محمد علی خاں میکش (سب رس 1932) مولوی محبّ حسین (معلم شفیق 1880) سید حسین بلگرامی (مخزن الفوائد 1874) اور عبدالحلیم شرر (دل گذار 1897) کے علاوہ مدراس کے بعض مدیران اپنے رنگ کے معروف جید علماء و ادباء میں شمار ہوتے تھے مثلاً مولانا ابوالجلال ندوی (مسلمان 1927) مولوی بدیع الدین فاروقی (مورخ 1912) سید جلال الدین گھائل (آفتاب دکن 1890 کے بعد) اور عبدالطیف فاروقی (آزاد ہند 1932) وغیرہ۔ یہ وہ مدیران تھے جن کے خلوص کی لوگ قسمیں کھاتے تھے۔

مدیروں کو آئے دن سرکاری مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ دکن میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ملتی ہیں جنھوں نے بے شمار مصیبتیں جھیلیں مگر اس سے کبھی منہ نہ موڑا۔ مثلاً آزاد ہند (مدراس 1932) کے مدیر مولانا عبدالطیف فاروقی ایک حق گو مدیر اور نہایت شعلہ بیان مقرر تھے (صفی اللہ، ص ۷۲) ان کے عہد میں راج پال نامی ایک شخص نے ایک متنازعہ فیہ کتاب لکھ کر حضور اکرام صلی علیہ وسلم کی ذات مبارک کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مسلمان نے اسے قتل کر ڈالا۔ بڑا ہنگامہ ہوا تاہم عبدالطیف نے اپنے اخبار میں اس کی تائید کی۔ جس کی بنا پر انھیں اپنا اخبار بند کرنا پڑا (صفی اللہ، ص ۷۵) مولوی محبّ حسین (معلم شفیق حیدرآباد 1880) ایک مصلح قوم تھے۔ مزاج کے اعتبار سے باغی واقع ہوئے تھے۔ موصوف آزادئ نسواں کے قائل اور پردہ کے سخت مخالف تھے۔ جناب نے حیدرآباد جیسے مسلم شہر میں ان کے خیالات کو قبولیت حاصل نہ

ہو سکی۔ نتیجتاً سرکار کی طرف سے اس رسالہ کو Ban کیا گیا۔ محب حسین نے رسالہ ہی بند کر دیا (انوارالدین ،ص 113)۔ دکن ریویو حیدر آباد (1939) کے مدیر اور مولانا ظفر علی خاں کو ایک نظم ''ذاکر نامہ'' لکھنے کی وجہ سے ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے برطرف کر کے شہر بدر کیا گیا۔ (انوارلدین 171) ایسے کئی مدیروں نے اپنے زمانہ کی مصیبتیں اٹھائیں مگر اپنے دامن افلاس پہ آنچ نہیں آنے دی۔

رسائل اور اخبارات کی اشاعت کا مقصد جتنا اعلیٰ وارفع ہوگا اس کے نقطۂ نظر کو اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوگی۔ دکن میں ابتدا ہی سے صحافت کے اس اہم اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ 1841 میں جامع الاخبار کی اشاعت کے مقصد کہا گیا تھا کہ ''اس نے ضیافت طبع خاص اور انتفاع عام ہوا (صفی اللہ 62) اعظم الاخبار (مدراس 1847) نے ذات پات کے فرق کو مٹانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا (صفی اللہ ،ص 45) 1911 سے 1920 کے دوران نکلنے والے رسائل نے ''تعلیمی وتمدنی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو سرگرم عمل رکھا۔'' (صفی اللہ 69) اس طرح حیدر آباد سے نکلنے والا ہر اخبار اور ہر رسالہ چوں کہ کسی نہ کسی خاص شعبہ علم وادب کی نمائندگی کرتا تھا، وہ اپنے اپنے قارئین کو مکمل معلومات بہم پہنچانے اور ان کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیتا تھا۔ اس کی دو بڑی وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اولاً یہ کہ اکثر وبیشتر رسائل، بالخصوص حیدر آباد کے، کسی نہ کسی انجمن یا فلاحی واصلاحی ادارے سے نکلے تھے۔ لہٰذا مدیروں کے نزدیک انجمن کے مقاصد کو اصلیت حاصل تھی۔ ثانیاً کہ کم وبیش تمام مدیر اپنے اپنے فن کے ماہر ہوا کرتے تھے۔ ماہر طب، ماہر قانون، ماہر تعلیم، ماہر تاریخ، ماہر تجارت، ماہر زراعت اور شعر وادب میں مہارت رکھنے والے وغیرہ۔ یہی وجہ تھی کہ دکن کی صحافت کی کامیابی میں اعلیٰ مقاصد کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ معیاری صحافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

اپنے اخبار اور رسالہ کی مقبولیت کے لیے اس کے مدیر کی محنت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ وہ کیا کیا نئے نئے طریقۂ کار استعمال کر رہا ہے۔ دکن کے بعض

رسائل کو دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ مدیروں نے کیا کیا نت نئے طریقے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ تحفہ (مدراس 1884) کی یہ خاص بات تھی کہ اس جریدہ کے کچھ صفحات میں ایک دیوان اور تاریخ قسط وار شائع کی جاتی تھی جس کو علاحدہ کرکے جمع کرنے سے ایک کتاب بن جاتی تھی (صفی اللہ 60) رسالہ تکمیل الاحکام (حیدر آباد 1899) کی خصوصیت ''یہ تھی کہ اس کے چاروں حصے علاحدہ علاحدہ ضمیمے کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ حصہ اول کا ضمیمہ ترکاریوں کی کاشت کے نام سے اور حصہ دوم کا ضمیمہ محبوب القوانین، حصہ سوم کا ضمیمہ ''مجموعہ قوانین مالگزاری'' اور حصہ چہارم کا ضمیمہ مصطلحات دکن کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ (انوارالدین 155) رسالہ خیال محبوب رحبوب عالم (حیدرآباد ر 1887) کی ''جدت یہ تھی کہ عشق و عاشقی کے پیرایہ میں علمی مباحث پیش کیے جاتے تھے یہ رسالہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ حصہ اول میں خیال محبوب، جس میں ہیرو کے ہجر و فراق کی کیفیات درج ہوتی تھیں۔ حصہ دوم میں وصال محبوب، اس میں ہیرو اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ (انوارالدین 161) اس طرح علمی مباحث ذہن نشیں کئے جاتے تھے۔ رسالۂ تاج (حیدرآباد 1914) کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ہر مضمون اور نظموں اور غزلوں پر اڈیٹر کا ایک مختصر سا تبصرہ بھی شائع ہوتا تھا (انوارالدین 1928) کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ مصور مجلّہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوتا تھا۔ نیز بہترین مضمون پر مضمون نگار کو ایک اشرفی انعام دینے کا رواج بھی تھا۔ جو آگے چل کر معاوضہ کی شکل اختیار کرگیا۔ اس خصوص میں رسالۂ حسن (1888) کے علاوہ دبدبۂ آصفی اور رسالہ افسر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مدیروں نے اپنے اخبارات و رسائل کی چھپائی اور ان کی دیدہ زیبی کے وقت نئے طریقے ڈھونڈا کرتے تھے۔ یہ ایسے ہی بے لوث خدمت گذاروں کی محنتوں و مشقتوں کا نتیجہ ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہے گی۔

جہاں تک مذکورہ تین اصولوں میں سے دوسرے اصول، عصری آگہی کا تعلق ہے، دکن کے رسائل و اخبارات کو دیکھنے سے فوری طور پر جو خیال ابھرتا ہے وہ یہ کہ تمام

اخبارات ورسائل اپنے قارئین کوعصری علوم وفنون سے اور تازہ ترین خبروں سے آگاہ کرانے میں کوئی کسر باقی رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ذیل میں اس خیال کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اخبار کا پہلا مقصد سیاسی خبروں کو عوام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ مدراس کے ابتدائی اخبار یہ فریضہ بخوبی انجام دیے ہیں۔ عمدۃ الاخبار (مدراس 1863) کا یہ جملہ اس خصوص میں کافی مقبول رہا ہے۔ ''جنگی خبریں اور سچی سچی کیفیتیں مانند ٹیلی گراف'' عوام تک پہنچانا (صفی اللہ 45) شمس الاخبار (مدراس 1878) نہ صرف روم اور روس کی جنگی خبروں سے عوام کو باخبر رکھتا تھا بلکہ اس نے حکومت ترکی کی تائید میں ہزار ہا روپیوں کا چندہ جمع کروایا تھا۔ حجاز دہلوی کے سلسلے میں بھی اسنے ایسی ہی خدمت انجام دی تھی (صفی اللہ ص 52) جریدۂ روزگار (مدراس 1871) کی سیاسی پالیسی سلطنت آصفیہ کے حق میں تھی۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ خبریں شائع کر کے سلطنت آصفیہ کے احوال سے اہل مدراس کو باخبر رکھتا تھا۔ اس اخبار نے ''روس اور ترک کی جنگ میں ترکوں کی حمایت کی تھی اور خوب کھل کر مضامین لکھے تھے۔'' (صفی اللہ، ص 55) قومی رپورٹ (مدراس 1914) نے اپنے آپ کو خلافت تحریک کے لیے وقف کر دیا تھا (صفی اللہ، ص 68) جب آزادئ ہند کی تحریک چلی تو مدراس کے اخبار آزاد ہند نے ترک موالات، مسلم لیگ اور کانگریس کی سرگرمیاں، فتنے فساد، زبان کے مسائل غرض ہر خبر کو شائع کر کے اپنے قارئین کو باخبر رکھا (صفی اللہ، ص 72)۔ حیدرآباد کے بعض اخباروں اور رسائل نے بھی سیاسی خبروں سے عوام کو واقف کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

دکن میں اردو صحافت کی ابتدا کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسی زمانہ کی بڑھتی ہوئی عیسائیت کا دنداں شکن جواب دیا جائے (جامع الاخبار ملاحظہ ہو صفی اللہ ص 45) عوام میں دلچسپی بدستور قائم رہی کہ عیسائیت کا سدّ باب کیوں کر کیا جائے۔ عوام عیسائی مشنریوں کی حرکتوں سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ عمدۃ الاخبار (مدراس 1863) اس ضمن میں پیش پیش دکھائی دیتا ہے (صفی اللہ ،ص 4 8)۔ نیز مظہر العجائب

(مدراس 1871) کی کوششیں بھی اس سمت دکھائی دیتی ہیں۔ (صفی اللہ، ص 57)
1934 میں ماہ نامہ رفیق جب منظر عام پر آیا تو اس نے بھی عیسائیت کے بڑھتے ہوئے مسئد کی انسداد کو اولیت دی (صفی اللہ، ص 75) حیدر آباد کے مقابلے میں مدراس میں عیسائی زیادہ بستے تھے اور ان کی تبلیغی سرگرمیاں بھی زیادہ تھیں۔ چوں کہ عوام ان سے باخبر رہنا چاہتے تھے اس لیے مدراس کے اخباروں میں اس ضمن میں بڑا جوش وخروش دیکھا جا سکتا ہے۔

صنعت وحرفت پر خصوصی توجہ مرکوز کرنے وقت کی بڑی ضرورت تھی۔ دکن کے اخبارات ورسائل، اس خصوص میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ آگے وہ رسائل میں مختلف صنعتوں پر معلوماتی مضامین چھپتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں سے لے کر کاشت کاری، باغ بانی وغیرہ پر بھی معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ مضامین نہ صرف عام آدمی کے لیے تھے بلکہ طلبہ کے لیے بھی تھے۔ رسالہ نمائش (حیدر آباد 1926) میں طلبہ کے لیے اس قسم کی چند تجویزیں پیش کی جاتی تھیں جن سے وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ معاش پیدا کر سکتے تھے۔ اس رسالہ میں ''مختصر سرمایہ داروں کے لیے'' مستقل عنوان کے تحت ایسی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں جن کے ذریعہ تھوڑا سرمایہ رکھنے والے اشخاص بھی اپنے طور پر خود کوئی کاروبار یا کارخانہ قائم کر کے اچھی خاصی آمدنی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی تجارتی وصنعتی ترقی کو بھی فروغ دے سکتے تھے۔ (انوار الدین، ص 195) صنعتی ترقی کے مختلف پہلوؤں سے اپنے قارئین کو باخبر رکھنا دکن کے اخبارات ورسائل کی خصوصیت رہی ہے۔

دکن میں بہت پہلے ہی ترجمہ کی اہمیت کو سمجھ لیا گیا تھا۔اس زمانہ کے اخبارات ورسائل نے ترجمہ کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شمس الاخبار (مدراس 1859) میں انگریزی اور عربی خبروں کا ترجمہ پیش کیا جاتا تھا۔ (صفی اللہ، ص 52) رسالہ طبابت حیدر آباد (1855) اور دکن میڈیکل جرنل 1898 (حیدر آباد) میں طب کے تعلق سے انگریزی مضامین کا ترجمہ شائع ہوتا تھا (انوار الدین، ص 92) مسلم نسواں

میں مفید کتابوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے (109)۔ معلم شفیق میں زراعت سے متعلق ترجمے شائع ہوتے تھے جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے جاتے تھے (ایضاً 101) منتخب روزگار (حیدر آباد 1895) کے تین حصے ہوتے تھے۔ اس کے دوسرے حصے میں انگریزی ناول اور ڈراموں کے ترجمے پیش کئے جاتے تھے (ایضاً115) رسالہ طیال مجوب (حیدرآباد 1887) رسالہ دل گداز (حیدرآباد189) وغیرہ میں بھی انگریزی ادب کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ ترجموں کے ذریعے عصری آگہی کو فروغ دینا دکن کی اردو صحافت کا امتیاز ہے۔

مادری زبان، اردو کا تحفظ اور اس کی بقا وقت کی سب سے بڑی بنیاد تھی۔ دکن کے وسائل واخبارات نے اس پکار پر لبیک کہا اور ضروری اقدامات کئے۔ اردو سے متعلق اخبارات وقتاً فوقتاً میں مضامین چھپنے لگے۔ مخزن الفوائد (حیدرآباد 1874) میں ''زبان اردو کا تغیر اور تبدل، اردو اور ہندی کا جھگڑا، وغیرہ اور معلم شفیق میں ''ترقی زبان اردو، دفتری کارروائی میں اردو ہونی چاہیے وغیرہ۔ دبدبۂ آصفی میں ''اردو ہندوستان کی عام زبان ہے رسالہ نسیم دکن (1902) میں زبان اردو جیسے مضامین کے علاوہ رسالہ معلم میں ہندستانی فلموں کی زبان پر کئی ایک مضامین شائع ہوئے ہیں۔ تیغ بہادر سپر کا مشہور مقولہ ''اردو مشترکہ تہذیب کی میراث ہے'' میں ان ہی دنوں کی یادگار ہے۔ (انوارالدین، ص 250)۔

تدریس وتعلیم کے میدان میں بھی دکن کے اخبارات ورسائل نے عصری آگہی کا ثبوت رہا ہے۔ پروفیسر انوارالدین کا خیال درست ہے کہ ایک ایسے دور میں جب تدریس کو ایک باضابطہ مضمون کی شکل نہ دی گئی تھی اسے رسائل کا موضوع بنانا بڑی بات تھی (انوارالدین 156) اساتذہ کو تدریس کے طریقے سمجھانے کے علاوہ نصاب کی غلطیوں اور خامیوں پر بھی کھلے طور پر بحثیں کی جاتی تھیں۔ (ایضاً) یہی نہیں اورنگ آباد سے ایک رسالہ ایسا بھی نکلتا تھا جس میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی تعلیمی سرگرمیاں اور کوائف درج ہوتے تھے (ایضاً 233) سامعین کی تعلیم کے لیے بے

شمار مضامین تحریر کیے جاتے تھے جس کے ذریعہ اپنے عہد کی نئی سائنسی تحقیقات سے عوام کو واقف کرایا جاتا تھا۔ رسالہ دبدبۂ آصفی میں تھرما میٹر، نظام شمسی، دوران خون ست، مادہ اجسام کی تحقیق، اعداد کی علامتیں، زمین کی حرکت اور نظام عالم کی تحقیق وغیرہ جیسے موضوعات پہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ (انوارالدین 123) ان سے نہ صرف اہل علم بلکہ عام آدمی بھی بہت کچھ سمجھتا اور سیکھتا تھا۔

مدراس میں بڑی بڑی تجارتیں مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی ہیں۔ لہٰذا حیرت کی بات نہ ہوگی اگر وہاں کی اردو صحافت میں ابتدا ہی سے تجارت سے متعلق معلومات نے جگہ پائی ہو۔ رسالہ ترقی تجارت (مدراس1912) ایک ایسا رسالہ ہے جس میں تجارت سے متعلق مضامین اور معلومات فراہم کی جاتی تھیں اور اپنے ملک کے تاجروں کو تجارت کی پرانی ڈگر سے چھوڑنے اور یورپ کے نئے نئے طریقوں کو اپنانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ ''اس رسالہ نے نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرلیا تھا جو اس کے لیے تجارتی اور تمدنی موضوعات پر مضامین لکھ سکتا تھا۔'' (صفی اللہ،ص 72) حیدرآباد کے رسائل میں، زراعت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ رسالہ فنون(1899) نے ''زراعتی و صنعتی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا ہے تا کہ ملک سے غریبی اور بے روزگاری دور ہو۔'' اس رسالہ میں دوسرے ممالک میں استعمال کئے جانے والے زراعتی طریقوں پر بھی بحث کی جاتی تھی۔ ''امریکہ میں زراعت کی ترقی،شکر کی زراعت، امریکہ کی کپاس وغیرہ جیسے مضامین اس کی مثالیں ہیں (انوارالدین،ص 152) حیدرآباد ہی کا ایک اور رسالہ ''میر اہل دہ(1929) اہل دیہات کو زراعتی، تجارتی اور صنعتی معلومات فراہم کرتا تھا۔ اور اس طرح انھیں زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا تھا۔

بیداریٔ نسواں بھی وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ دکن کے اخبارات و رسائل نے اس خصوص میں بھی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ کئی ایک ایسے رسائل ہیں جو عورت کو زمانہ کے ساتھ قدم قدم ملا کر چلنے کی ترغیب دلائے تھے۔ رسالہ النساء (حیدرآباد 1920) انجمن خواتین دکن کی نگرانی میں جاری کیا گیا تھا۔ بقول پروفیسر

انوار الدین ''یہ خواتین کے لیے ایک اہم اور معیاری رسالہ تھا۔'' (ص 191) اس میں عورت کی زندگی کے ہر پہلو کی اصلاح کے مشورے شائع ہوتے تھے۔ دوسرے رسالوں میں، زنانہ کالج میگزین ((190) خاوند (1922) رسالہ ہم جولی (193) رسالہ سفینۂ نسواں (1932) رسالہ مومنہ (1993) وغیرہ۔ یہ تمام رسائل حیدر آباد سے شائع ہوئے۔ مدراس سے کسی مخصوص رسالۂ نسواں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ حیدر آبادی خواتین ان رسائل کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتی تھیں اور عصری آگہی حاصل کرتی تھیں۔

دکن میں بچوں کے رسائل کافی تاخیر سے 1911 میں شروع کئے گئے ہیں۔ حیدر آباد میں آغاز صحافت کے 56 سال بعد بچوں کا رسالہ جاری کرنے کا خیال کیا گیا ہے۔ تاہم دیر آید درست آید کے مصداق جب بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف رجوع کیا گیا تو پوری دلچسپی اور انہماک کا ثبوت دیا گیا۔ حیدر آباد میں بچوں کے پہلا رسالہ ''ادیب الاطفال'' کے نام سے 1911 میں نکلا اس کے بعد 1918 میں اتالیق اور 1921 میں نونہال جاری کیا گیا۔ان ہی بچوں کی ذہنی تربیت کے علاوہ عصری علوم وفنون کونہایت دلچسپ ودلکش انداز اور آسان زبان میں سمجھایا جاتا تھا تاکہ بچہ زمانہ کی رفتار کو سمجھ سکے۔ ان کے علاوہ دوسرے رسائل میں مسلم اور ہزارداستان (1930) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مقالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کی صحافت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ قارئین زمانہ کی رفتار سے آگاہ کرائے اور انھیں زمانے کے ساتھ چلنے کا ہنر سکھائیں۔

کامیاب صحافت کے لیے اس کا قاری احساس ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ قاری اس سے غیر متعلق مطالعہ پر اپنی محنت کی کمائی کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اپنی دلی تسکین چاہیے۔ دکن میں اردو صحافت کی بنیاد ''ضیافت طبع خاص اور انتفاع عام'' (جامع الاخبار کا مقصد اشاعت، صفی اللہ، ص 40) پر رکھی گئی تھی۔ چنانچہ جو اخبار اس اصول زریں پر کاربند رہا پچاس پچاسی برسوں تک چلتا رہا اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ قصر گمنامی میں جاپڑا۔ حیدر آباد میں اور رسائل کی بنیاد وحدتِ موضوع پر رکھی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بنیادی طور پر قاری اس میں رسالوں کی شکل اختیار

کر گئے۔ طب، ادب، قانون، تاریخ، حسن کاری، تعلیم و تدریس، فوج، اسکاوٹز، ورزش، سوانح عمریاں، سوسائٹی عام معلومات وغیرہ۔ غرض ہر شعبۂ حیات سے متعلق رسائل و جرائد نکلا کرتے تھے اور اہل ذوق قارئین باوجود، اردو رسائل واخبارات کی بہت زیادہ ہونے کے خریدتے تھے۔ (اقبال 105) حیرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں ترک سکرات جیسے موضوع پر ایک علاحدہ جریدہ نکلتا تھا۔ جس میں کثرت شراب نوشی کے بُرے نتائج سے قارئین کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ علمی رسائل میں، علمی مباحث بھی وہی اٹھائے جاتے تھے جن میں عوام دلچسپی لیتے تھے۔ یوں نہ ہوتا کہ عوام کا ذوق کچھ ہے اور اخبار کا کچھ اور۔ چنانچہ اس عہدہ اخبارات رسائل کے مطالعہ سے پورے سماج کی تصویر واضح ہوجاتی ہے اور یہ کہ سماج کیا سوچ رہا ہے؟ کیا تحقیق کر رہا ہے اور کیا لکھ پڑھ رہا ہے یا آیئے ذیل میں انیسویں کے وسط سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک قارئین کی مختلف دلچسپیوں کا جائزہ لیں، جن کی بنیاد پر دکن میں کامیاب صحافت وجود میں آتی تھی۔

اسلام اور ممالک اسلام سے اور قارئین کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ علی الخصوص مسلمان قارئین کے۔ مدیروں اور مالکانِ اخبار کو اس کا بہ خوبی علم ہے چنانچہ وہ اس خلوص میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح اخبار اور عوام دونوں قوم کی دردمندی میں شامل ہوجاتے ہیں۔ رسالہ ادیب (حیدرآباد 1880) کے ایڈیٹر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ وہ اسلاف اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا مقابلہ کرکے مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب تلاش کرنا ہی ان کے اخبار کا مقصد ہے (انوارالدین 100) یہ محض ایک مدیر کا بیان نہیں ہے بلکہ اسے اردو اخبارات ورسائل کا عمومی رجحان سمجھنا چاہیے۔ اخبار کے کسی نہ کسی گوشے پہ آواز سنائی دیتی ہے۔ الحامی (مدراس 1894) اسلامی ممالک کی تازہ ترین خبریں فراہم کرانے میں پیش پیش تھی (صفی اللہ 61) آفتاب دکن (مدراس، انیسویں صدی کا آخری اخبار) نہ صرف اسلامی کوائف کو بیان کرتا تھا بلکہ بعض متنازعہ کی مسائل پر بھی بحث کرتا تھا۔ اس ضمن میں اس کے اداریہ بڑے پُر مغز ہوتے تھے (صفی اللہ 65) نصیر (1906) وانمباڑی،

مدراس کا ایک مذہبی اخبار تھا۔ (صفی اللہ 68) حیدر آباد کے رسالہ معلم اللہ (1892) کے ایڈیٹر محب حسین نے اپنے رسالہ میں دو کالم مختص کرر کھے تھے۔ ایک میں وہ ہندستان کے مشہو مسلم بادشاہوں کے اہم کارناموں اور حالاتِ زندگی کو پیش کرتے تھے تو دوسرے کالم، تذکرۃ النساء کے عنوان کے تحت ''مختلف مسلم حکمراں خواتین کے تذکرے بیان کرتے تھے (انوارالدین 109)۔ حیدر آباد ہی کے ایک اور رسالہ، رسالہ سحر بیان (1895) میں اسلامی فرمارواں، شہ زادی سلطانہ رضیہ اور بلقیس جہاں کی سوانح حیات نہایت دل چسپ انداز میں پیش کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں ''محاصرہ دمشق'' کے نام سے ایک تاریخی کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس میں مسلمانوں کے اسلاف کے جواہر ومردانگی اور جوش مذہبی کا عبرت ناک مرقع پیش کیا گیا تھا۔ نیز اس اخبار میں مذہب کی تخلیق باالاقساط شائع ہوا تھا (انوارلادین ،ص 114) یہ وہ مراد ہے جس سے قارئین کے ایک بڑے طبقہ کی تسکین ہوتی ہے۔

اخبار کے ادبی پہلو کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اردو قارئیں کی ایک کثیر تعداد اس کی منتظر رہتی ہے۔ چنانچہ اردو اخبارات ورسائل اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ مدراس کے اخبار نیر اعظم (1864) کے اشتہار کے تحت گرداں اور شستہ اشعار میں اخبار کی نوعیت، پالیسی، قیمت اور روقفہٗ اشاعت کی متعلق تفصیل درج ہوتی تھی۔ پروفیسر صفی اللہ کا خیال ہے کہ نثر کی بہ نسبت اس کی نظم برجستہ، صاف اور تصنع سے پاک ہوتی تھی۔ 'مردوک پر فارسی کے چار مصرع درج ہوتے تھے (پروفیسر صفی اللہ،ص 53) مظہرالعجائب (ایضاً1884) کے سرورق پر بھی ایک فارسی شعر لکھا جاتا تھا۔ (صفی اللہ،ص 57) مدراس کے کئی اخبار مثلاً سفینہ (1928) مصحف (1935) دلچسپ (1934) مشعل (1951) فن کار (1951) منزل (1953) شاکر (1953) پاکیزہ(1959) اور اتحاد (1951)وغیرہ نے یہاں کے برگزیدہ شعراء وادباء کی تخلیقات کو پیش کیا۔ (صفی اللہ ،ص8) مدراس کے ایک رسالہ کی انفرادیت یہ تھی کہ اس نے ادب کے ساتھ ساتھ اردو شعراء کوقسط وار شائع کر کے اہل مدراس کی اردو کو بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ حیدرآباد کے رسالہ مخزن الفوائد (1847) میں بھی ادب کے ساتھ زبان

کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔اس رسالہ کی خاص بات یہ تھی کہ اسے بقول پروفیسر انوارالدین اس وقت مشہور انشاء پردازوں کا تعاون حاصل تھا۔ (انوارالدین،ص 97-96) اس خصوص میں مولوی عبدالحق کے رسالہ کی خدمات محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہ رسالہ 1921 اورنگ آباد دکن سے جاری ہوا اور اس نے اردو ادب کی بے پناہ خدمت انجام دی ہے۔ حیدرآباد سے نکلنے والے رسالہ تاریخ (1924) نے دکنی ادب کو اجاگر کرنے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ (انوارالدین،ص 277) مدراس سے نکلنے والے اخبارات گواہ ہیں کہ معاصرانہ چشمکوں خواہ سیاسی ہوں یا ادبی،کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ یہ ایک صحت مند مقابلہ کی علامت ہے بشرط کہ اس میں تلخی نہ پیدا ہو۔ مدراس (1884) کے ضمیمہ کے طور پر نکلنے والے''گرنا نک پنچ'' میں بعض خبروں اور رپورٹوں کے بیان میں طنز ومزاح سے کام کیا جاتا تھا۔(صفی اللہ،ص 60) مدراس کے معاصرانہ چشمکوں میں ایک ادبی سلیقہ ہوتا تھا۔ اس کی عمدہ مثال مولوی عبدالحق نے یہ دی ہے کہ ایک اخبار کا نام احسن الجراید (1881) تھا جسے اس کے مخالفوں نے ایک نقطہ کی تبدیلی سے اخسن الجراید کردیا۔ اور بقول مولوی عبدالحق یہ گیت کچھ ایسی بھپ گئی کہ اخبار کے بند ہونے کے ایک مدت کے بعد تک یہ نام عام طور پر مشہور رہا'' (بحوالہ صفی اللہ،ص 58)۔ زبان وادب کے یہ روشن پہلو اخبارات ورسائل کی مقبولیت اور ان کی فروختگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے تھے۔

کامیاب لوگوں کی زندگیوں میں جھانکنا اور ان کے رازہائے حیات سے واقف ہونا انسانی تجسس کا وہ مفید پہلو ہے جس کی روشنی میں آدمی اپنے آپ کو سنوارنا چاہتا ہے۔ دکن کے اکثر مدیران اخبار اس راز سے بخوبی واقف ہے۔ کئی ایسے اخبار ورسائل ہیں جن میں سلف صالحین کی سوانح عمریوں قسط وار شائع ہوتی تھیں۔ رسالہ سحر بیان(1895) میں ''مشاہیر کی دلچسپ وپر موعظت سوانح عمریاں شائع ہوتی تھیں۔'' (انوارالدین،ص 114) دبدبہ آصفی (حیدرآباد 1879) میں مختصر حالاتِ ملکہ وکٹوریہ کے علاوہ دوسری نامورہستیوں کے حالاتِ زندگی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے (انوارالدین ،ص 123) جام جمشید (1900) میں حضرت امام شافعی اور حیدرعلی خاں

والی میسور کے علاوہ بادشاہوں کے تاریخی حالات شائع ہوتے تھے۔(انوارالدین،ص 126) دل گداز (1897) میں عبدالحلیم شرر نے بی بی سکینہ کی زندگی کے حالات پیش کیے تھے اور رفیق دکن (1884) میں مشہور مصنفوں کی سوانح عمریاں قسط وار شائع ہوتی تھیں۔ (انوارالدین،ص 158) اخبارات ورسائل کا یہ وہ کالم تھا جس سے قارئین کے دل کا چوکھا گرم رہتا تھا۔

صحت اور طب کا موضوع بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ دکن کے دو رسائل طبابت حیدرآباد، (1855) اور دکن میڈیکل جرنل (حیدرآباد 1898) نے عوام میں طبی معلومات بہم پہنچانے کا کام بڑے پیمانے پر کیا تھا (انوارالدین،ص 88.86.22) بعض رسائل ایسے بھی تھے جو قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ ان میں رسالہ مقنن دکن (حیدرآباد 1885) اور دستور آصفی (1928) کے ایک حصہ میں عوام کو فرامین آئین اور احکام وغیرہ کی معلومات دی جاتی تھیں۔ (انوارالدین 131 اور 208) فوجیوں کے لیے رسالہ جیت 1962 میں جاری ہوا تھا۔ یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ Dawn Internet کی تحقیق کے مطابق ٹیپو سلطان کی فوج کے لیے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ اگر یہ بات مصدقہ ہے تو دکن میں 1823 سے اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ (Dawn Internet Edition) فوج کے ساتھ ورزش اور اسکاوٹز پر بھی دکن میں رسائل نکلے۔ پروفیسر انوارالدین کے مطابق دکن میں ”ادب، شاعری، موسیقی، رنگ کاری، آذری اور تعمیر وغیرہ کی ترویج کے لیے رسالہ حسن کار (1936) جاری کیا گیا۔ (انوارالدین،ص 268) رسالہ دوآتشہ (1939) خاص ماڈرن لٹریری سوسائٹی کا ترجمان تھا (ایضاً،ص 280) عام معلومات کے لیے رسالہ معلومات (حیدرآباد 1940) شائع ہوتا تھا۔ اس طرح عورتوں کے لیے مفید عام (مدراس 1969) اور حیدرآباد کے لیے ایک رسائل عورتوں کے لیے دلچسپ کام پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آغاز صحافت ہی سے کتابت اور طباعت کی صفائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ زبان آسانی، اور رواں ہوتی تھی۔ دکن کے بیشتر

رسائل واخبارات نے قارئین کی دلچسپیوں ،اوران کے ذوق صحافئی کا خیال رکھا تھا۔
جن رسائل نے اس طرح توجہ نہیں کی وہ اپنے عہد کے ناکام اخبار کہلائے مثلاً مدراس
میں 1881 سے 1890 تک تقریباً12 نئے اخبار جاری ہوئے مگر وہ قارئین کی توقعات
کو پورا نہ کرسکے۔اس لیے وہ بہت جلد ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ چنانچہ دکن کی
تاریخ صحافت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں صرف اوراخبارات ورسائل کوکیا
حاصل ہوئی جن کی اساس،ذوق قارئین پررکھی گئی تھی۔

دکن میں اردوصحافت کے اس صد سالہ مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے
کہ جن مدیروں نے اپنی ان تھک محنت اور مسلسل لگن کا ثبوت دیا،جنھیں عصری تبدیلیوں
اور تقاضوں کا کامل شعور حاصل تھا اور جو قارئین کے بدلتے ہوئے ذوق کی پرکھ اور سمجھ
رکھتے تھے۔ انھوں نے جنوبی ہندستان میں اردوصحافت کے پرچم بلند کیے لیکن جنھوں
نے اس کا مخالف رخ اختیار کیا، نہ وہ اپنی شناخت بناسکے اور نہ ہی ان سے زبان وقوم
کی کوئی خدمت سرانجام ہوسکی۔

حوالہ

1۔ انوارالدین، پروفیسر، حیدرآباد کن کے علمی وادبی رسائل، مکتبہ شاداب، ریڈ ہلز،حیدرآباد، 1997
2۔ افضل الدین اقبال، پروفیسر،جنوبی ہند میں اردوصحافت اور ریاست حیدرآباد میں اردوصحافت کا آغاز وارتقاء،حیدرآباد۔
3۔ صفی اللہ، پروفیسر،تمل ناڈو میں اردوصحافت،سرمدی پبلکیشنز، مدراس 2004۔

ڈاکٹر رضوان احمد

اردو رسائل (صوری و معنوی معیار کے اعتبار سے)

ہندستان میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کے جو اعداد وشمار دستیاب ہیں ان کے مطابق روزناموں کا اوسط دس فی صد ہے۔ بقیہ نوے فی صد Periodicals جرائد ہیں ان میں سہ روزہ، ہفتہ روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، دوماہی، سہ ماہی رسالے ہیں۔ ان کے موضوعات بھی الگ الگ ہیں جہاں سہ روزہ، ہفتہ روزہ اور پندرہ روزوں پر سیاست حاوی ہے وہیں ماہناموں میں ادبی، نیم ادبی، یا ثقافتی رسائل زیادہ ہیں ویسے تو اردو میں تقریبا ہر موضوع پر رسائل شائع ہوتے ہیں جن میں فلمی، طبی، مذہبی یا دینی اور روحانی رسائل بھی ہیں تو خواتین اور بچوں کے رسالے بھی، سائنسی اور جاسوسی جریدے بھی چھپتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے جن میں خواتین کے ڈائجسٹوں کی تعداد خاصی ہے۔

اردو میں میقاتی جرائد کی اپنی روش رہی ہے جو تمام ہندستانی زبانوں میں سب سے الگ تھی مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' نکالا تو انھوں نے صحافت کی ایک نئی بنیاد ڈالی کیوں کہ یہ ہفتہ وار نہ صرف معنوی لحاظ سے بے حد منفرد تھا بلکہ صوری

اعتبار سے بھی اس میں بے حد جاذبیت تھی کیوں کہ اس وقت تک ہندستان کی کسی زبان میں اس طرح کا جریدہ شائع نہیں ہوتا تھا۔

1938 سے فلمی رسالہ ''شمع'' شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے بالکل الگ طرح کی صحافت کی بنیاد ڈالی کیوں کہ اس قسم کا فلمی رسالہ کسی بھی ہندستانی زبان میں نہیں نکلا تھا۔ اسی ادارہ شمع نے ہر موضوع پر منفرد قسم کے رسالے نکالے جن میں خواتین کا رسالہ ''بانو''، بچوں کا رسالہ ''کھلونا''، جاسوسی رسالہ ''مجرم''، ثقافتی رسالہ شبستان ڈائجسٹ۔ اس ادارے نے ہی ایک بے حد قابل ذکر میقاتی جریدہ ''آئینہ'' چھٹی دہائی میں شائع کرنا شروع کیا جس کی عمر چند سیاسی وجوہات سے مختصر رہی لیکن اس نے اردو صحافت پر بڑی گہری چھاپ چھوڑی۔ یہ سب کے سب رسائل اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایک اور میقاتی جریدہ جس نے قومی سطح پر اپنی شناخت قائم کی وہ اردو ہفتہ وار ''بلٹز'' تھا۔

آج اردو کے جو میقاتی جرائد قومی سطح پر اپنی شناخت رکھتے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ''الہلال'' اور ''آئینہ'' جس زمانے میں شائع ہوئے اس وقت ذرائع ابلاغ کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوئی تھی لیکن آج ذرائع ابلاغ ہوا سے باتیں کررہے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر اردو کے رسائل کو دیکھیں تو کچھ مایوسی ہوتی ہے۔

آج اردو کے جو رسائل بازار میں موجود ہیں ان میں عالمی سہارا، نئی دنیا، اخبار نو، خبردار جدید، گواہ، افکار ملی، سالار ویکلی، نشیمن، انقلاب ہفتہ وار ایڈیشن، الرسالہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ہمارے اخبارات ورسائل کا بنیادی عنصر سیاست ہے۔ اس میں کچھ عجیب بھی نہیں ہے کیوں کہ ہم ایک جمہوری نظام میں بستے ہیں اور سیاست ہماری رگ وپے میں سرایت کرچکی ہے اس لیے اخبارات ورسائل میں سیاسی عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ مقامی واقعات وحادثات پر تبصرے ہوتے ہیں۔ عالمی سطح کے کچھ واقعات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ادب، ثقافت، فلم، اسپورٹس وغیرہ کے لیے صحافت وقف

ہوتے ہیں لیکن ترقیاتی خبروں، بازار کے اتار چڑھاؤ اور شیئرس Shares وغیرہ کو اردو رسائل میں بہت اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ ان کے قارئین کی اس موضوع میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ موٹے طور پر اردو کے میقاتی جرائد کے یہی مندرجات ہیں۔

لیکن حال ہی میں شروع ہوئے ہفتہ وار جریدہ ''عالمی سہارا'' نے اردو رسالے کو ایک نئی شکل وصورت دی ہے۔ چونکہ یہ اردو کا پہلا اخبار ہے جو کسی صنعتی گھرانے سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اس لیے اس کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے۔ اسے مواصلات کی تمام جدید ترین سہولیات حاصل ہیں۔ یہ ہرلحاظ سے مکمل جریدہ ہے مگر اس کا ادارتی عملہ ابھی بھی اس کے معیار وتزئین سے مطمئن نہیں ہے کیوں کہ چھ ماہ میں ہی دوبار اس کے سائز میں بھی تبدیلی کی گئی ہے اور مندرجات میں بھی صوری تبدیلی بھی آئی ہے اور معنوی بھی۔ یہ رسالہ ابھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے جس میں نئے امکانات کی کافی گنجائش ہے۔

لیکن اس کے علاوہ جو ہفتہ وار اخبارات ہیں مثلاً نئی دنیا، اخبارنو، گواہ، نشیمن، سالار ویکلی، انقلاب ہفتہ وار ایڈیشن ان کے مندرجات میں بہت یکسانیت ہے۔ یہ سب کم وبیش ایک ہی سائز میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ ہنگامی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جہاں تک سالار اور انقلاب کا سوال ہے یہ اپنے روزانہ ایڈیشن سے متاثر ہوتے ہیں ایک طرح سے یہ ان کے ہفتہ بھر کے مندرجات کا اختصار پیش کرتے ہیں لیکن کچھ مضامین اس سے الگ نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اس کے علاوہ روزانہ میں جہاں خبریں ہوتی ہیں وہیں ہفتہ وار میں ان موضوعات پر تبصرے ہوتے ہیں۔

نشیمن کا دائرہ بہت محدود ہے۔ وہ صرف انھیں موضوعات کو لیتا ہے جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے اس کے علاوہ اس نے روایتی صحافت کو ہی گلے لگا رکھا ہے۔ اس طرح کے کئی درجن اور جرائد ہیں مگر ان کی حیثیت مقامی ہے انھیں میں ایک رسالہ ''گواہ'' بھی ہے اگرچہ اس کے مندرجات بھی حیدرآباد یا آندھرا پردیش تک ہی محدود

ہیں مگر وہ کچھ قومی خبروں پر بھی تبصرے کرتا ہے۔

''نئی دنیا'' اور'' اخبارنو'' راجدھانی سے شائع ہوتے ہیں اوران میں بہت یکسانیت رہی ہے۔ آج بھی ان کے مواد میں بہت یکسانیت ہے اگرچہ صوری اعتبار سے دونوں خاصے مختلف ہوگئے ہیں جہاں نئی دنیا نے گٹ اپ، سٹ اپ اور تصویری صحافت پر توجہ دی ہے وہیں ''اخبارنو'' مواد کی پیش کش تک محدود ہے لیکن دونوں کا بنیادی محور سیاست ہے۔ ہنگامی موضوعات اس میں زیادہ جگہ پاتے ہیں،ادب، فلم ،اسپورٹس وغیرہ کے مستقل کالم تو اس میں ہیں مگر ان کی حیثیت نمک سے زیادہ نہیں ہے۔اس کا ایک سبب تو صفحات کی کمی ہے دوسرے وسائل کی جو دوسری زبان کے بڑے اخبارات کو حاصل ہیں اور اردو جرائد ان سے محروم ہیں۔ وہ نہ تو ہر موضوع کے لیے علیحدہ ڈیسک بناسکتے ہیں اور نہ ہی الگ الگ نمائندے مقرر کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

دوسرے میقاتی جرائد میں پندرہ روزہ خبردار، ماہنامہ افکارملی ، ماہنامہ الرسالہ کوبطورنمونہ لے سکتے ہیں۔خبردار تو ہفتہ وار جریدوں کا تتمہ ہے اور الرسالہ اپنے مدیر کی تحریروں کا مجموعہ وہ گوناگوں موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں اوریہی تحریریں اس رسالے میں شائع ہوتی ہیں۔البتہ افکارملی کے موضوعات میں وسعت ہے وہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات وحادثات کواپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ عالم اسلام اور عالم عرب پر بھی نظررکھتے ہیں۔اوراندرون ملک پیش آنے والے واقعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں لیکن خبروں اوران پر تبصروں کے لیے ایک ماہ کا عرصہ بہت زیادہ ہے ایک ماہ میں خبریں پرانی ہوجاتی ہیں کیوں کہ ابھی میڈیا بہت تیز رفتار ہوگیا ہے خاص طور سے الیکٹرانک میڈیا کی وسعت نے پرنٹ میڈیا کو بہت پیچھے کردیا ہے۔

اگرہم دنیا کے چند بڑے رسائل ٹائم، نیوز ویک، گارجین ،آب زرور وغیرہ سے اپنے ملک کے انگریزی رسائل کاموازنہ کریں توہمیں مایوسی نہیں ہوتی ۔صوری اورمعنوی دونوں اعتبار سے انڈیا ٹوڈے، آؤٹ لُک ،فرنٹ لائن اوردی ویک کوان کے

مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ سب گونا گوں موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ٹائم یا نیوز ویک کی طرح ان کے یہاں بھی ذہنی وسعت ہے لیکن ہمیں ہندستانی جریدوں کا موازنہ مغربی ممالک کے اخبارات سے نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ وہاں کی صحافتی روایت چھ سو سال قدیم ہے جب کہ ہمارے یہاں صحافت کی عمر ابھی دو سو برس سے کچھ زیادہ ہوئی ہے۔ اس لیے یہ موازنہ غیر منطقی ہوگا۔ مگر جہاں تک اردو کے میقاتی جرائد کا سوال ہے تو اردو صحافت کی بنیاد ہی ہفتہ وار جریدے سے پڑی تھی۔ ''جام جہاں نما'' ویکلی اخبار تھا اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کے مندرجات میں وسعت تھی پہلے ہی شمارے میں بتایا گیا تھا کہ دخانی کشتی کلکتہ کے ساحل پر پہنچ گئی ہے۔ لیکن ترتیب، وتزئین، گٹ اپ، سٹ اپ، تزئین و آرائش کی بنیاد مولانا آزاد کے ''الہلال' نے سنہ 1912 میں ڈالی۔ بلاکوں کا سب سے پہلے استعمال بھی یہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد 1938 میں ''شمع'' نے تزئین وآرائش کو بام عروج پر پہنچایا۔ وہ آفسیٹ صحافت کا دور نہیں تھا اس وقت ''شمع'' کے تمام صفحات بلاک بنا کر شائع کیے جاتے تھے۔

آج ہندستان کے متعدد اردو جرائد بہت ہی خوبصورت انداز میں شائع ہوتے ہیں ان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ترجمان ''اردو دنیا'، دہلی اردو اکادمی کا ''ایوان اردو'' بھی قابل ذکر ہے۔ امریکن سنٹر کا رسالہ ''اسپین'' اپنی جاذبیت کے لحاظ سے ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

فی الوقت ہندو پاک کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ درجن ممالک سے اردو جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں کئی اپنی جاذبیت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ منزل، نیویارک، تصویر، برمنگھم،، نوائے ٹوکیو (جاپان) ماہرگشت سویڈن، ہم سفر، ہانگ کانگ کا حسن تو آنکھوں کو خیرہ کردیتا ہے البتہ ان کا مواد اتنا باوقار نہیں ہے۔ پاکستان کے میقاتی جرائد کا میں یہاں ذکر نہیں کررہا ہوں کیوں کہ اس سے مقابلے کی طوالت کا خوف ہے البتہ ''جنگ'' کے ادارے سے شائع ہونے والا رسالہ ''اخبار جابر'' ہر لحاظ سے مکمل اور بھرپور جریدہ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اردو کے اخبارات ورسائل نے صوری ومعنوی اعتبار سے کامیابی کی کافی منزلیں طے کی ہیں۔اور بیشتر جرائد خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ نے اردو صحافت کو بھی فیض یاب کیا ہے۔ خاص طور سے کمپیوٹر کے استعمال نے تو صحافت کو نئے انقلاب سے ہم کنار کردیا ہے۔آج اردو کے بیشتر اخبارات وجرائد کمپیوٹر پر ہی شائع ہورہے ہیں۔ کتابت اردو صحافت کی سستی کا سبب تھا مگر کمپیوٹر کی ایجاد نے یہ مسئلہ ہی حل کردیا۔

لیکن ہندستانی زبانوں کے روزنامے اور میقاتی جرائد جس برق رفتاری سے سفر کررہے ہیں اردو صحافت اس تناظر میں کافی پیچھے ہے۔ اگر ان کا موازنہ کیا جائے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔صرف ترتیب وتہذیب اور اشاعت ہی نہیں موازنہ کیا جائے تو ہمیں اپنی پسماندگی کا احساس ہوتا ہے مگر ان کے اپنے الگ اسباب ہیں۔

انگریزی کا ''انڈیا ٹوڈے'' ہندی، ملیالم، تیلگو اور تامل میں بھی شائع ہوتا ہے۔چونکہ انڈیا ٹوڈے کا بہت بڑا نٹ ورک ہے اس لیے اس کے تمام جریدے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ انڈیا ٹوڈے نے اردو میں بھی ایک ڈمی شائع کرکے وسعتوں کی تلاش کی تھی مگر اسے وافر تعداد میں قاری نہیں مل سکے اس کے علاوہ اردو قارئین کا مزاج بھی دوسری زبان کے قاری سے مختلف ہے۔

انگریزی جریدہ ''آؤٹ لُک'' کا بھی ہندی ایڈیشن شائع ہوتا ہے جو کافی کامیاب ہے۔ ان کے مدیران نے اپنے قارئین کے مزاج کو سمجھا ہے اس لیے ہندی کے مندرجات انگریزی سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ ہندستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والے چند میقاتی جرائد اور ذکر شے از خروارے کے طور پر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے— بنگلہ زبان کے ''دیش' اور ''پرتمان'' دوسرے ہفتہ وار جریدے ہیں جو اپنے مواد کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں تو گجراتی کے ویکلی گجرات سماچار اور جنم بھومی ، ملیالم کے ''ملیالم منورما اور منگلم ،کنڑ کے ''ترنگا'' سدھا اور منگلا ، مراٹھی کے ویکلی ''سکل''

اور آسامی کے " سادِن " SADIN بھی اہم میقاتی جرائد ہیں۔ ان جرائد کی تیز رفتار ترقی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی بڑے روزنامے سے وابستہ ہیں جن کے سبب ان کے پاس بڑا انٹ ورک ہے۔

اردو کے میقاتی جرائد کا ان کے ہم دوش نہ ہو پانے کا ایک سبب تو یہی ہے کہ ان کے دوش بدوش کوئی بڑا روزنامہ نہیں ہے اور دوسرا سرمایہ اور وسائل کی کمی ہے۔ انگریزی، ہندی اور علاقائی زبانوں کے تمام بڑے اخبارات کسی نہ کسی سرمایہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ اردو کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ آج کی صحافت مکمل طور پر تجارت بن گئی ہے اس لیے اسے صرف قلم کی طاقت پر نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ آج کی صحافت کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اس لیے ہم ہندستان کی صحافت کا موازنہ ہم عصر ہندستانی صحافت سے کرتے ہیں تو ہمیں کافی مایوسی ہوتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو اخبارات کو قدم قدم پر جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اشتہارات جرائد کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اردو اخبارات کو یہ بہت کم تعداد میں ملتے ہیں۔ اردو رسائل کے قارئین کی تعدا بھی کم ہے اس کی وجہ ان کی قوت خرید میں کمی ہے۔ ان حالات میں اردو کے اخبارات نکل رہے ہیں اور اپنی حیثیت و موجودگی کا احساس کرا رہے ہیں یہ کچھ کم نہیں ہے۔ اس کے لیے اس کے منتظمین اور مدیران کو بھی داد دی جانی چاہیے کہ ایسے حوصلہ شکن حالات میں بھی ان کے عزائم کم نہیں ہوتے۔

الیکٹرانک میڈیا کی وسعت کے سبب پورا پرنٹ میڈیا ہی ان کا شکار ہے اس لیے ہمیں اردو صحافت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بحران بالکل وقتی ہے اور مستقبل میں بھی پرنٹ میڈیا کی اہمیت کم ہونے والی نہیں۔

اقبال مسعود

اردو اخبارات اور ترجمہ

ہندستان میں اردو صحافت کا مستقبل اردو زبان کے عروج وزوال سے وابستہ ہے۔ وہ زبان جس نے سب سے پہلے عوام کو غلامی کا احساس دلایا اور جدوجہدِ آزادی کے لیے زمین ہموار کی جس کے صحافی حق گوئی کی پاداش میں پھانسیوں پر جھول گئے، توپوں سے اڑائے گئے اور قیدو بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جس نے زبان کے گلشن میں نت نئے قسم کے پھول کھلائے کہ ان کی رنگا رنگی، خوبصورتی اور خوشبو نے نہ صرف ہندستان کی فضاؤں کو مہکا دیا بلکہ انگلینڈ، کنیڈا، امریکہ، ماریشش اور خلیجی ممالک تک میں اپنی دھوم مچادی۔ وہ زبان جو آزادی کے فوراً بعد اپنے قارئین اور بولنے والوں کے بوتے پر سرکاری زبان بنائے جانے کی دعویدار تھی اپنوں کی سازشوں اور آسمان کی فتنہ پردازی سے ملک کی قومی زبان تو کیا بنتی آج اپنی زندگی کی بقاء کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔ گذشتہ نصف صدی سے اگر اردو زندہ ہے تو یہ کرشمہ ہے اردو والوں کے بجائے خود اردو کی قوت بقاء کا کہ ایسے دگرگوں حالات میں نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہی ہے۔

بیسویں صدی کے رخصت ہوتے ہوتے برقی ذرائع ترسیل میں ایک ایسا

انقلاب آ گیا کہ اس نے دنیا کو ایک مختصر گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے دوسری طرف پوری دنیا نئے ورلڈ آرڈر کی وجہ سے ایک وسیع منڈی کی شکل اختیار کر گئی ہے اب ہر چیز بکاؤ مال بن گئی ہے اور اس میں وہی کامیاب ہوگا جو اپنے کو ''سیل ایبل'' بنا سکے ایسے وقت میں جب کہ اردو دنیا میں نہ کمال کے افکار ہیں نہ کمال کے کردار نہ کوئی مکتبہ خیال ہے نہ کوئی نظریۂ حیات ۔ یہاں تک کہ اردو صحافت میں ندرت خیال کی روایت بھی کمزور پڑ چکی ہے اور جدید عہد کی فضاؤں میں سیاست اور معیشت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اس حبس زدہ ماحول میں نہ سیاست کی نظر عنایت ہے نہ ہی سرمایہ داروں کی ذرہ نوازیاں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صحافت اب تحریک نہیں رہی بلکہ تجارت بن چکی ہے حد تو یہ ہے کہ اخبارات کا گیٹ اپ سیٹ اپ تک بڑی کمپنیوں کے اشتہارات اور ان کی مرضی سے بنائے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ تجارت کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں اس میں اگر کسی مال کی مناسب قیمت نہیں ملتی تو رڈیکشن کر دیا جاتا ہے اور اردو صحافت اسی ''سیل'' کے دور سے گذر رہی ہے۔

ذرائع ابلاغ میں اخبار کا رول شاندار ہے چند کاغذ کے پرزوں پر ساری دنیا سمٹ کر آجاتی ہے اور عصری آگہی کا وسیلہ بنتی ہے دنیا میں جہاں بھی اور جس حصہ میں بھی حقیقی جمہوریت قائم ہے وہاں اخبار کی طاقت اور اہمیت مسلم ہے اخبارات کی حق گوئی ان کے ذریعہ برسر اقتدار حکومتوں کی نقطہ چینی اور انویسٹیگیٹ رپورٹنگ سے سرکاریں ہراساں ہیں۔ لیکن اردو اخبارات جمہوریہ ہند میں اپنے تاریخی کردار کو اس قوت، توانائی اور ایمانداری کے ساتھ ادا نہیں کر رہے ہیں جو اس کی وراثت ہے اور جو ان کا شاندار ماضی تھا، زبان کی زوال پذیری کا اثر زبان کے ہر شعبے پر پڑتا ہے اور جب زبان کو معیشت سے کاٹ دیا جاتا ہے تو یہ اثر خیزی مزید تباہ کن ہو جاتی ہے۔

آج جب کہ اطلاعاتی ٹکنالوجی کے وسیلے سے علم و معلومات کا سیلاب آ گیا ہے اور حقائق معلوم کرنے کے وسیع تر امکانات پیدا ہو گئے ہیں اردو اخبارات کے لیے مترجم کی ضرورت ناگزیر ہوگئی ہے، ویسے بھی ترجمہ اردو اخبار میں ریڑھ کی ہڈی کی

حیثیت رکھتا ہے اگر چہ یہی صورت حال دنیا کی بہت سی دوسری زبانوں کی بھی ہے۔اخبار کے اپنے نامہ نگاروں کی تحریروں، اداریوں اور ایک آدھ فیچر سے ہٹ کر جو طبع زاد ہوں تو ہوں سارا اخبار ترجمہ کا ہی مرہون منت ہوتا ہے لیکن اردو اخبار کے پاس صلاحیتوں کوخریدنے کی حیثیت ہی نہیں ہوتی مشکل تو یہ ہے کہ وہ خدمات کو کم سے کم اجرت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کم اجرت پر معیاری خدمات کیسے حاصل کی جاسکتی ہیں؟ چنانچہ پہلے ہی مرحلے میں غیر ترتیب یافتہ اور ناقص مترجموں سے سابقہ پڑتا ہے جو بقول شوکت تھانوی Sunday کا دھوپ کھانے کا دن Sweet Meat کا میٹھا گوشت Small Sea کا چھوٹی بحر اور Alive Wind کا زندہ باد ترجمہ کرتے ہیں۔اس طرح کے غیر معیاری اور ناقص تراجم والی خبروں سے اردو سے بے اعتنائی برتنے والا قاری جو پہلے سے ہی اردو صحافت کو بے کار کی چیز سمجھ چکا ہے اس سے کچھ اور متنفر ہوجاتا ہے اور پھر جب وہ دوسری زبان سے واقف ہو تو جھجک کیا معنی وہ محض اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی بقا کے نام پر ہر ماہ اپنی محنت کی کمائی کیوں خرچ کرے چنانچہ وہ اردو اخبار سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

ترجمہ ایک فن ہے اور دیگر فنون کی طرح یہ بھی ذہانت، ذکاوت ،ریاض اور تخلیقی صلاحیتوں کا متقاضی ہے۔اسی ترجمہ کے فیضان سے اور ہمارے بزرگوں کی محنت سے اردو زبان اس مرتبہ کو پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ اور ثقہ زبانوں سے آنکھیں چار کرسکے۔ اردو اخبارات میں ترجمہ کی روایت دوسو سال سے زیادہ قدیم ہے لیکن ۲۱ ویں صدی کی اس ابتدائی دہائی میں جب کہ اردو اخبارات کو اردو ٹیلی پرنٹر سے خبروں کی فراہمی کی جارہی ہے۔ترجمہ کے مسائل ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں ۔سید ضیاء اللہ نے اپنی کتاب اردو صحافت ترجمہ وادارت میں لکھا ہے کہ یونائیٹیڈ نیوز آف انڈیا(UNI) نے جب اردو سروس شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو سب ایڈیٹروں ،مترجموں اور نامہ نگاروں کی ضرورت پڑی تو کوئی تیس (30) امیدوار امتحان میں شریک ہوئے ان میں بی اے بھی تھے،ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں والے بھی ،کہنہ مشق صحیفہ نگار بھی

تھے اور نئے نئے ماس کمیونیکیشن کے انگریزی کورس کے ڈپلوما ہولڈرس بھی۔ دو ایک قابل احترام مستثنیات سے قطع نظر کسی کا ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں تھا اگرچہ سب امیداوار دلی سے تعلق رکھتے تھے۔ یو این آئی میں بھی خبریں انگریزی سے ہی ترجمہ کی جاتی ہیں اس کا بھی حال یہ ہے کہ یکم مارچ 2004 کو ٹیلی پرنٹر پر بھیجی گئی کچھ خبروں کو جو بغیر کسی خاص توجہ کے نکال لی گئی ہیں زبان و بیان کی یہ حالت ہے۔

- اقوام متحدہ (یکم مارچ) رائٹر۔ اس میں فتح انقلابی کانسل (کاؤنسل) کی جگہ تحریر ہے۔
- اسی دن ایک خبر میں کے ایل سہگل کو ''ہ'' کے بجائے ''ے'' سے سیگل لکھا گیا ہے۔
- ایک اور خبر میں ترجمہ کا کھردرا پن توجہ طلب ہے۔ ''ایک اسرائیلی فوج ٹریبونل نے ایک فوجی افسر کو ایک کمسن فلسطینی کی موت کے معاملے میں غفلت کا مجرم پایا۔''
- ایک اور خبر میں۔ ''جنوبی ایشیا کے تعلقات میں بہتری کے کارواں کا سفر آسان بنائیں گے۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ادارے میں اردو خبروں کے ترجمہ کا نہ کوئی پرسان حال ہے نہ ان کی مانیٹرنگ کی جاتی ہے اور نہ ہی اردو اخبارات اس سلسلے میں جو شکایات کرتے ہیں اس پر توجہ دی جاتی ہے یہاں بھی لاپرواہی اور زوال آمادگی کا وہی حال ہے جو اردو کے زیادہ تر اخبارات کے دفاتر میں مترجموں کا ہے۔

ہندستان میں اردو اخبارات کے بڑے بڑے مراکز دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد، بھوپال، پٹنہ، سری نگر، ممبئی اور جالندھر ہیں۔ ہر جگہ کا اپنا محاورہ ہے، الفاظ ہیں، طرز نگارش ہے اور املا بھی۔ ان پر علاقائی زبان کے الفاظ اور لب ولہجہ کی چھاپ ہے۔ یہی حال پاکستان کے کراچی، لاہور اور پشاور کا ہے۔ ہر جگہ کا محاورہ ایک دوسرے سے الگ ہے ہونا تو یہ چاہیے کہ لب ولہجہ، املا اور محاورہ یکساں ہو اس سلسلے میں بازار میں آسانی سے انگریزی اردو ڈکشنریاں دستیاب ہیں جن میں انگریزی الفاظ کے اردو متبادل لفظ

موجود ہیں لیکن جملوں میں ان کے محل استعمال کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، بعض اردو اخبارات کے دفاتر تو اتنے تہی دست ہوتے ہیں کہ وہاں کوئی ڈکشنری موجود ہی نہیں ہوتی، مترجم جو جی میں آئے لکھ مارے چنانچہ اس کی تحریروں میں ''اتحاد ہل جاتا ہے۔''، ''تحفظ پہنچایا جاتا ہے۔''، ''تباہی بچائی جاتی ہے۔'' ،''ضد کچلی جاتی ہے۔''، ''گہری ذمہ داری ہوتی ہے''، ''مہاراشٹر کو شدید فائدہ پہنچتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ ملک بھر میں ایک طرح کی معیاری اور اخباری زبان فروغ پائے۔شہروں، ناموں اور ڈگریوں وغیرہ کا املا یکساں رکھا جائے درحقیقت ترجمہ کا فن مسلسل ریاض اور مشق چاہتا ہے۔اس سلسلہ میں پروانہ ردولوی رقم طراز ہیں کہ ترجمہ آسان اور دلچسپ ترین فن ہے اس میں تخلیق کا بالکل دخل نہیں اگر آپ جس زبان کا ترجمہ کررہے ہیں اور اسے جانتے ہیں اور آپ کو روزانہ تین چار اخباری کالموں کا ترجمہ کرنا ہے تو پہلے اس خبر کو پڑھ ڈالیے بمشکل پانچ سو انگریزی الفاظ کسی گریجویٹ کے لیے پوری زندگی میں نئے آئیں گے بار باران الفاظ کے آنے سے رفتہ رفتہ یہ مشکل حل ہوجائے گی اور الفاظ، اصطلاحات اور محاورے جو موضوع کی رعایت سے خود بہ خود ذہن میں اپنے معنی ومفہوم ڈال دیتے ہیں جو بالکل سچ ہوتے ہیں۔ان کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ کوئی فن کار ایک دن میں بڑا فن کار نہیں بن جاتا اس کے لیے لگن، محنت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

ترجمہ عالمی سطح پر خیال وافکار، فکرونظر، معلومات نیز خبروں کی ترسیل کا ذریعہ ہے اور کسی بھی زبان کے اخبارات کو ترقی کرنے اور معاصر خبروں اور نظریات سے آگاہی اور قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لیے ترجمہ سے مفر نہیں ترجمہ کا فن جتنا ترقی کرے گا زبان کی ترقی کے امکانات اتنے ہی روشن ہوں گے۔اردو اخبارات کو ملک کی سطح پر معلومات اور تازہ خبروں سے باخبر کرنے اور زبان کو عالمی سطح پر ایک مقبول اور طاقتور زبان بنانے کے لیے ترجمہ کے فن پر خاطر خواہ توجہ صرف کرنی ہوگی،اس مسئلہ کا حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح کچھ جامعات میں ماس کمیونیکیشن کے اردو ڈپلوما کا نصاب ہے اسی طرح

اردو ترجمہ کے لیے بھی ڈپلوما کورس شروع کیا جائے جس میں عام معلومات کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی تاریخ ،لفظ ومعنی کی صحت ،محاورہ ،روزمرہ ،املا ،تذکیر وتانیث، واحد جمع ، جملوں کی ساخت، انگریزی نیز متعلقہ علاقائی زبانوں میں جملوں کی تشکیل ،محاورے اور ان کے اردو متبادل وغیرہ نصاب میں شامل کئے جائیں اس کے ساتھ ہی طلباء کو کسی اہم روزنامہ میں دو ماہ کی تربیت لازمی قرار دی جائے اس کے بعد ہی ڈپلوما دیا جائے یہ کام اردو اکادمیاں اور این سی پی یو ایل کے تعاون سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ صلاحیت خود کفیل روزگار میں بھی معاون ہوگی۔

حرف آخر یہ کہ اردو قارئین کی سمٹتی تعداد حقیقی بحران نہیں ہے۔ آزادی سے قبل اردو اخبارات کی طباعت لیتھو مشین پر کی جاتی تھی ظاہر ہے کہ اس مشین پر دو تین ہزار سے زیادہ اخبار شائع کرنا ممکن نہ تھا لیکن آج جدید فوٹو آفسیٹ پریس پر یہ تعداد منٹوں میں ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے ۔اردو کے بڑے بڑے اخبارات جیسے راشٹریہ سہارا (دہلی ،لکھنؤ) ،سیاست، منصف (حیدرآباد)، سالار، پاسبان (بنگلور)، ہند سماچار (جالندھر) ، تیج (دہلی، حیدر آباد، دکن)، آزاد ہند(کلکتہ)،انقلاب ،اردو ٹائمز (ممبئی)، قومی آواز (دہلی) وغیرہ کی کل تعدادِ اشاعت آزادی سے قبل شائع ہونے والے اخبارات کی مشترکہ تعداد سے دس گنا زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ متعدد شہروں سے نکلنے والے دوسرے روزنامے اور ہفت روزہ اخبار الگ ہیں یہ سب کمپیوٹر، ٹیلی پرنٹر، انٹرنیٹ، ماڈِم اور جدید طباعتی مشینوں اور سازوسامان سے آراستہ ہیں رنگین طباعت سے لیس اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں ان میں سے بیشتر کے ملازمین کو قومی اخبارات کے مساوی مشاہرا بھی ملتا ہے۔ آخر یہ اخبار کہاں جاتے ہیں ظاہر ہے کہ سارے اخبارات دریابرد تو نہیں کئے جاتے اور نہ ردی بنائے جاتے ہیں ان کو قاری بھی میسر ہے اگر چہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ عہد میں چھپے ہوئے الفاظ کی قدر و قیمت کم ہوگی اور یہ صدی انفارمیشن ٹکنالوجی کی صدی ہوگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صدی علم ودانش کی صدی ہے اور چھپے ہوئے الفاظ کی قدر و قیمت کبھی بھی کم نہ ہوگی ۔ ذوق اخبار بینی ہماری

روز مرہ کی زندگی کا حصہ بنا رہے گا۔ پھر بھی بہت کچھ ہونا ہے اور اس میں سب سے زیادہ ذمہ داری اردو والوں کی ہے۔ جب ہم خود ہی کچھ نہیں کرتے تو سرکار سے یا کسی ادارے سے کیا امید۔ دعائیں بھی جب ہی مستجاب ہوتی ہیں جب صدقِ دل سے مانگی جائیں۔

اگر ہندستان کے اردو بولنے والوں کو اپنا قومی وتاریخی فریضہ ادا کرنا ہے تو ان کو اردو کا ایک اخبار خریدنے کی عادت ڈالنی پڑے گی یہ بوند بوند مل کر ساگر بن جائے گا اور تب ہی اردو پر آئی ہوئی خزاں کچھ کم ہوسکتی ہے اور تب ہی نئے برگ وبار کی امید کی جاسکتی ہے۔ جو مستقبل کو روشن نہیں تو کم از کم گھور اندھیرے، ذہنی شکست وریخت اور پژمردگی سے نجات تو دلا سکتی ہے ورنہ اردو والوں کی وراثت ان کی حق گوئی اور ماضی کی شاندار روایت تو متقاضی ہیں کہ ان سے یہ کہا جائے ؎

اے ہمتِ مرداں یزداں بہ کمند آید

ڈاکٹر جمیل اختر

سرخیاں اخبار کی

ہم لوگ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہماری نگاہوں سے اخبارات کی مختلف طرح کی سرخیاں گزرتی ہیں۔ بڑی سرخیاں، چھوٹی سرخیاں، موٹی سرخیاں، باریک سرخیاں، اخبار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی سرخیاں، تین لائنوں، چار لائنوں کی سرخیاں، باڈر ڈالی ہوئی سرخیاں، ریورس سرخیاں وغیرہ وغیرہ۔

کیا آپ نے کبھی ان سرخیوں کی بناوٹ، ان کی اہمیت اور ان کی اقسام پر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً نہیں اس لیے کہ عام قاری کے پاس اس طرح کے سوالوں پر غور کرنے کا موقع ہی کہاں ہوتا ہے۔ وہ تو صرف خبروں کے اوپر لگی دلچسپ سرخیوں کے مزے لیتا ہے اور انھیں چٹخارے لے لے کر پڑھتا ہے۔ کبھی ان پر تبصرے بھی کرتا ہے، پھر مسکراتے ہوئے اخبار الگ رکھ دیتا ہے۔

ذرا غور کریں تو یہی سرخیاں قاری کو اخبار پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی سرخی اتنی دلچسپ اور دلکش ہوتی ہے کہ قاری بے اختیار اخبار کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اس لیے سرخی کو اخبار کی جان یا ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہیے۔ سرخی کا مقصد ہی اخبار کو پرکشش

بنانا ہوتا ہے۔ اخبار کی تزئین و آرائش میں سرخی اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس لیے ہر اخبار سرخی کو جامع اور پر کشش بنانے پر پوری توجہ صرف کرتا ہے۔

اخبار کے پہلے اور آخری صفحے پر چوں کہ صرف خبریں ہوتی ہیں اور یہی دو صفحات قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اس لیے ان کی سرخیوں کی اہمیت بالکل الگ ہے۔ خبر کی سرخیوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ''سروے آف جرنلزم'' کے مرتبین نے کہا ہے کہ ''ایک اچھی سرخی کو خبر کے اشتہار کا کام دینا چاہیے یا خبر کا خلاصہ بیان کرنا چاہیے اور اس صفحے کی خوبصورتی میں حصہ لینا چاہیے جہاں وہ چھپے۔''

راتھن برگ کے الفاظ میں جدید انداز کی سرخی کے دو مقصد ہوتے ہیں:

1۔ اس امر کی طرف فوراً توجہ دلائے کہ اخبار میں مخصوص دلچسپی کی خبریں موجود ہیں۔

2۔ بے حد مصروف یا کاہل قارئین کو واقعات کا خلاصہ مہیا کر دے۔''

برطانوی صحافی میز فیلڈ (Mansfield) کے الفاظ میں: ''سرخی کا کام یہ ہے کہ ایک تو خبر کی اہم ترین اور مرکزی بات کو اجاگر کرے، دوسرے خبر کی نوعیت اور لہجے کی عکاسی کرے۔'' ایک اور امریکی صحافی پبلیٹز کے نزدیک اچھی سرخی وہ ہے جو ''تصویر کشی بھی کرے اور تلخیص بھی۔ کوزے میں دریا بند کرے اور کسی عقیدے یا ذوق کو مجروح کیے بغیر قاری کی توجہ کھینچ لے۔''

ان تعریفوں کی روشنی میں سرخی کے جو اہم مقاصد اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں انھیں ہم اختصار سے یوں بیان کر سکتے ہیں اچھی سرخی وہ ہے جو:

1۔ قاری کی توجہ حاصل کرے۔

2۔ خبر کا خلاصہ بیان کرے۔

3۔ خبر کا تعارف کرائے۔

4۔ خبر کے اشتہار کا کام دے۔

5۔ اخبار کی تزئین و آرائش میں مدد دے۔

6۔ خبروں کی تقابلی اہمیت کو واضح کرے۔

7۔ دلکش اور دلچسپ ہو۔

8۔ جامع اور جاذب نظر ہو۔

9۔ خبر کے خصائص کو اجاگر کرے۔

سرخی لکھتے وقت اگر ان مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا تو بہتر سرخی لکھی جا سکتی ہے۔ جب سرخی اچھی ہوگی تو قاری کی توجہ اخبار کی طرف مبذول ہوگی اور اس کی فروخت پر خاطر خواہ اثر پڑے گا۔ سرخیاں اخبار کو فروخت کرنے میں کئی طرح کارآمد ہوتی ہیں۔ اکثر وہ قاری پر ہونے والے اثرات کو اجاگر کر کے یہ مقصد حاصل کرتی ہیں، اس لیے کہ جس سرخی کا تعلق قاری کی زندگی سے براہِ راست ہوگا قاری کی توجہ اس طرف فوراً مبذول ہوگی اور وہ اخبار کی طرف لپکے گا۔ مثلاً سرخی اس طرح کی ہو:

.... 2004 کے بجٹ میں ٹیکسوں میں بھاری چھوٹ

....غذائی اجناس کی قیمتوں میں بھاری گراوٹ

...تنخواہوں میں اضافے کے لیے کمیشن کا قیام

ان تمام سرخیوں کا تعلق قاری کی نجی زندگی سے براہ راست ہے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوگا۔ بعض سرخیاں اس بنا پر توجہ حاصل کر لیتی ہیں کہ ان میں انسانی ہمدردی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، بعض میں اخلاقی پہلو ہوتے ہیں اور بعض دلچسپ ہوتی ہیں۔

اس لیے سرخیاں لکھتے وقت پوری توجہ صرف کرنی چاہیے کہ وہ خوبیوں کی حامل ہوسکیں۔ ایک مشہور صحافی کا قول ہے کہ ''مجھے سرخیاں لکھنے دو۔ خبروں کی تفصیل تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔''

سرخیوں کی اہمیت

جس طرح روح کے بغیر جسم بے جان اور غیر متحرک ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح سرخیوں کے بغیر اخبار بے جان ہے۔ سرخیاں اخبار میں جان ڈالتی ہیں اور قاری کو اخبار کے مطالعے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس طرح اخبار کو سرخیوں کی وجہ سے عوام میں قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ "The Press in My Times" مصنف آر۔ ڈی بلیو مینز

فیلڈ R.D.Blue Mansfield لکھتے ہیں:

''سرخیوں نے صحافت کو مقبول عام بنایا ہے۔ مقبول عام اخبار کا مقصد قاری کی توجہ کھینچنا، اس کی دلچسپی ابھارنا اور اسے یہ دیکھنے پر آمادہ کرنا ہے کہ اخبار میں اہم باتیں کیا ہیں۔ چنانچہ اخبار یہ مقصد سرخیوں کے آزادانہ استعمال سے پورا کرتا ہے۔''

صحافت کے آغاز میں خبروں کی تقسیم علاقے کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ مثلاً دہلی کی خبریں، علی گڑھ کی خبریں، رامپور کی خبریں وغیرہ وغیرہ۔ مضامین کے سلسلے میں سرخی محض عنوان کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، جیسے صحت اور غذا، آب وہوا اور تعلیم نسواں وغیرہ۔

جب اردو صحافت نے کچھ ترقی کی تو سرخیوں کے انداز میں بھی تبدیلی آگئی۔ اب علاقے کے بجائے واقعے پر زور دیا جانے لگا۔ جیسے دلی اور بہار کی خبریں کی بجائے دہلی میں بارش، بہار میں سیلاب، رامپور میں فساد ہوگیا۔ یہ پہلی سرخی کی ترقی یافتہ شکل تھی مگر اب سرخی اس سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ یعنی اب سرخیاں بیک وقت لیبل کا کام بھی دیتی ہیں، متعلقہ مواد کا تعارف بھی کراتی ہیں اور اخبار کی تزئین وآرائش میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ قارئین کی اکثریت اب محض سرخیوں پر ہی گزارہ کرنے لگی ہے۔ اس صورت حال کے مدِنظر امریکی صحافی ناول نیل مکین نے کہا ہے کہ ''امریکیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ صرف سرخیاں پڑھنے والی قوم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ہر قوم سرخیاں پڑھنے والی قوم بنتی جارہی ہے۔''

موجودہ صورت حال میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی خبر کے پڑھے یا نہ پڑھے جانے کا انحصار بڑی حد تک سرخی پر ہوتا ہے۔ اخبار کے صفحے پر قاری کی نظر سب سے پہلے سرخی پر پڑتی ہے۔ اگر کسی خبر کی سرخی نے اسے متوجہ کرلیا تو وہ اس خبر کو پڑھے گا ورنہ نمایاں سرخیوں پر ہی ایک نظر ڈال کر اخبار کو الگ رکھ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ

سرخیاں ہی قارئین سے اخبار پڑھواتی ہیں، سرخی ہی کی بدولت قارئین اپنی دلچسپی کی خبریں تلاش کر کے پڑھتے ہیں۔ یعنی یہاں بھی سرخی ہی ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

سرخی کے اوصاف

خبر کو پڑھوانے میں سرخی کے کردار کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ سرخی کے کچھ وصف مقرر کر دیے جائیں تاکہ اچھی اور کامیاب سرخی کا ایک معیار قائم رہ سکے۔ اب تک سرخی کی تعریف، مقاصد اور اہمیت پر جو روشنی ڈالی گئی ہے اس کے پیش نظر ایک اچھی اور کامیاب سرخی کو مندرجہ ذیل اوصاف سے بہرہ ور ہونا چاہیے۔

1۔ خبر کے متن سے ہم آہنگ ہو۔

2۔ خبر کے مزاج اور لہجے کی عکاسی کرے۔

3۔ خبر کے خلاصے یا اہم ترین نکتے کو صحیح طور پر بیان کرے۔

4۔ آسان اور قابل فہم ہو۔

5۔ اس میں اخبار کی رائے کا اظہار نہ ہو۔

6۔ قاری کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرے۔

7۔ ضابطہ اخلاق کے اندر رہتے ہوئے پرکشش ہو۔

8۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اس جگہ کے مطابق ہو جہاں وہ دی جائے۔ یعنی سرخی نہ تو گنجان ہو، نہ کھلی کھلی ہو اور جگہ کے مطابق اس میں محدود الفاظ ہوں۔

9۔ اس میں الفاظ کی تکرار نہ ہو۔

10۔ وہ ابہام سے پاک ہو۔

11۔ مواد کے برعکس نہ ہو۔

سرخیاں لکھنے کے اصول

یوں تو سرخی لکھنے پر کوئی بندش لگانی مشکل ہے پھر بھی سرخی لکھنے میں فنی اور

اخلاقی پہلو کو مدنظر رکھا جانا چاہیے۔ اخلاقی طور پر کوئی بھی سرخی مواد کے برعکس نہیں ہوسکتی۔ یعنی غلط سرخی لگانا ایک طرح سے اخلاقی جرم ہے کیوں کہ قارئین کی اکثریت سرخیاں پڑھنے تک محدود رہتی ہے اس لیے ان کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ سرخی لکھتے وقت اس پہلو پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ ممتاز امریکی صحافی میز فیلڈ کا کہنا ہے کہ :" جس طرح مصنوعات پر جعلی لیبل لگانا قانون کی نظر میں جرم ہے اسی طرح خبروں پر گمراہ کن سرخیاں دینا اخلاقی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔"

فنی نقطۂ نظر سے سرخی کے تقاضے مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ سرخی کی بنیاد خبر کے ابتدائیے پر رکھی جائے، اس لیے کہ ابتدائیہ میں خبر کا نچوڑ ہوتا ہے۔

2۔ سرخی پورے فقرے کی صورت میں دینی چاہیے۔

3۔ سرخی کی لمبائی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے۔

4۔ سرخی کا مطلب واضح ہونی چاہیے۔

5۔ لفظوں کی تکرار نہیں ہونی چاہیے۔

6۔ زبان آسان اور عام فہم ہونی چاہیے۔

سرخیوں کی بہت سی قسمیں ہیں اور یہ تقسیم مندرجہ ذیل امور پر مبنی ہے۔

1۔ طوالت: چوں کہ صحافت میں پیمائش کا پیمانہ کالم ہے، اس لیے سرخیاں بھی اسی پیمانے سے ناپی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک کالمی، دو کالمی، تین کالمی، چار کالمی، پانچ کالمی سرخیاں وغیرہ۔ سرخیوں کی یہ تقسیم دراصل خبروں کی اہمیت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو خبر جتنی زیادہ اہم ہوگی اخبار میں اسے اتنی ہی زیادہ جگہ ملے گی اور پھر اس کی سرخی بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ ایک کالمی خبر کی سرخی بھی ایک کالمی ہوگی اور چار کالمی خبر کی سرخی بھی چار کالمی ہوگی۔

2۔ ہیئت:

سرخیوں کی دوسری تقسیم ان کی ہیئت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ مثلاً لیبل سرخی،

ریورس سرخی، بغلی سرخی، جلی سرخی اور خفی سرخی وغیرہ۔

3۔بناوٹ:

سرخیوں کو ان کی بناوٹ کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔مثلاً ایک منزلہ سرخی،منزل دار سرخی،آویزاں حاشیہ،خلش سرخی،مثاث معکوس وغیرہ۔

ذیل میں سرخیوں کی تمام اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

تلمیحی سرخی (Allusion Lead): اس طرح کے ابتدائیوں میں عموماً تاریخی،مذہبی ، ثقافتی اور ادبی تلمیحات کا ذکر کیا جاتا ہے اور پھر اس تلمیح کا تعلق خبر میں بیان کردہ شخص یا واقعے سے قائم کیا جاتا ہے۔

جلی سرخی(Bold Heading): جلی حروف میں دی گئی سرخی کو جلی سرخی کہتے ہیں۔

حاشیہ دار یا چوکھٹا سرخی(Border or Frame Headline):ایسی سرخی جس کو نمایاں کرنے کے لیے اس کے گرد حاشیہ دے دیا جائے۔نوعیت کے اعتبار سے یہ کسی بھی طرح کی سرخی ہو سکتی ہے۔

اشاراتی سرخی(Catch-line Lead): جو سرخی اصل واقعے کی تفصیل دینے کی بجائے واضح اشارے کے طور پر ایک دو تین الفاظ پر مبنی ہو، اشاراتی سرخی کہلاتی ہے۔ یہ سرخی عموماً ایسی خبر پر دی جاتی ہے جو کسی مشہور واقعے سے متعلق ہو اور جس میں واقعے یا جگہ کا نام اشارے کے طور پر لکھ دینے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہو کہ واقعہ کہاں رونما ہوا۔ اس قسم کی سرخی دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ کم جگہ میں آتی ہے اور مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے مثلاً

جدہ : حاجیوں کی واپسی مشکل ہوگی۔

افغانستان : طالبان نے عورتوں کے لیے پردہ لازمی قرار دیا۔

تضمینی ابتدائیہ(Citational Lead): اس قسم کے ابتدائیوں میں کسی مقبول گانے، زبان زد شعر،مقولے،کہاوت، محاورے اور ضرب المثل کو استعمال کیا جاتا ہے اور پوری خبر اس کی تضمین کے انداز میں بیان کی جاتی ہے۔

اجتماعی سرخی (Combination Headline): بعض اوقات ایک ہی علاقے یا ایک ہی قسم کی خبروں پر ایک اجتماعی سرخی لگادی جاتی ہے۔ مثلاً دلی کی خبریں، سہارن پور کی خبریں، علی گڑھ کی خبریں وغیرہ۔

مکالماتی ابتدائیہ (Concersational Lead): مکالماتی ابتدائیہ کا آغاز کسی ایک شخص کے بیان سے کیا جاتا ہے اور اس کے فوراً بعد کسی دوسرے شخص کا بیان ہوتا ہے۔ اس طرح جب اخبار نویس ایک مسئلے کے دو متضاد پہلو ایک ہی خبر میں پیش کرنا چاہتا ہے تو مکالماتی ابتدائیے کی مدد لیتا ہے۔

دوہرا فلش ابتدائیہ (Double Flush Lead): جس سرخی میں تمام سطریں کالم کے دائیں کنارے سے بائیں کنارے تک پہنچتی ہوں۔ مثلاً:

''ہندستان میں دہشت پسندی بند نہ ہوئی تو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ کانگریس کے اجلاس میں مقررین کا اظہارِ خیال۔''

زینہ دار سرخی (Dropline Lead): زینہ دار سرخی عام طور پر تین سطروں میں زینے کی صورت میں دی جاتی ہے مثلاً:

یوپی میں بسوں کی عام ہڑتال
مسافروں کو سخت پریشانی کا سامنا
اپوزیشن نے حکومت پر سخت تنقید کی

آٹھ کالمی سرخی (Eight Column Lead): جلی حروف میں وہ شاہ سرخی جو اخبار کے اوپری سرے پر اس طرف سے (یعنی پہلے کالم سے آٹھویں کالم) تک نمایاں طور پر پھیلی ہوتی ہے) اسے بینر کا نام دیا گیا ہے۔

پانچ، چھ اور سات کالمی سرخیاں (Fifth to seventh Column Lead): وہ سرخی جس میں کسی واقعے یا اہم ترین بات کو بیانیہ انداز میں دیا جائے، بیانیہ سرخی کہلاتی ہے۔ مثال کے طور پر (۱) امریکہ کا عراق پر حملہ، کئی ٹینک اور طیارے تباہ۔ (۲) میلے میں آتش زدگی، ہزاروں لوگ جاں بحق ہوگئے۔ (۳) وزیر اعظم کا

امرتسر کا دورہ۔

انوکھی سرخی(Novelty Headlines): جو سرخی قاعدے اور ضابطے کی پابند ہونے کے بجائے عجیب وغریب مگر دلچسپ ہو، انوکھی سرخی کہلاتی ہے۔ انوکھی سرخیاں عموماً ایسی خبروں پر دی جاتی ہیں جو زیادہ دلچسپ اور عجیب وغریب ہوتی ہیں۔مثلاً قرآن کا معجزہ، چوروں کی برات، جس دیس میں گنگا بہتی ہے۔

سوالاتی ابتدائیہ (Question Lead): جب خبر کی ابتدا کسی سوال سے کی جاتی ہے اسے سوالاتی ابتدایہ کہتے ہیں۔

ریورس سرخی(Reserve Heading): سرخی یا دوسرے متن کو اس طرح پیش کرنا کہ زمین سیاہ اورالفاظ سفید رنگ میں ہوں، یا زمین کسی اور رنگ میں ہواور الفاظ کسی اور رنگ میں۔ایسی سرخی ریورس سرخی کہلاتی ہے۔

بغلی سرخی(Side Heading): وہ ضمنی سرخی جو کالم یا صفحے کے ایک طرف یعنی بغل میں دی جائے۔بغلی سرخی کہلاتی ہے۔ انگریزی میں یہ سرخی بائیں اوراردو میں دائیں طرف دی جاتی ہے۔

یک کالمی سرخی (Single Column Heading): ایک کالم میں دی جانے والی سرخی کو یک کالمی سرخی کہتے ہیں۔ پہلے یک کالمی سرخی صرف ایک منزلہ ہوا کرتی تھی۔لیکن اب اس کی کئی صورتیں ہوگئی ہیں۔ مثلاً زینہ دار، حاشیہ دار، منزل دار، مثلث معکوس، آویزاں حاشیہ اورفلش۔

خفی سرخی (Slight Headline): باریک حروف والی سرخی خفی سرخی کہلاتی ہے۔ یہ عموماً جلی سرخی کے نیچے ہوتی ہے۔

ضمنی سرخی (Sub Heading): ضمنی سرخی خبر یا مضمون کے اندر دی جاتی ہے تاکہ ان کی لمبائی سے قاری تنگ نہ آجائے۔ علاوہ ازیں جن نکات کونمایاں کرنا ہوتا ہے، انھیں ضمنی سرخی میں سمو دیا جاتا ہے۔ اس طرح مواد کے اہم نکات نہ صرف واضح ہوجاتے ہیں بلکہ پڑھنے والے کوبھی آسانی ہوجاتی ہے۔

دو کالمی سرخی (Two Column Lead): دو کالموں کی اس سرخی کو زیادہ تر بڑی خبروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر اس کی شکل کوئی بھی ہو سکتی ہے یعنی یک منزلہ یا سہ منزلہ۔ الفاظ کی بندش بھی جگہ کے حساب سے ہوتی ہے، جس کا تعین اخبار کے میک اپ اور تزئین وترتیب کے اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔

سہ کالمی سرخی (Three Column Lead): تین کالمی سرخی بھی منزلوں کے حساب سے کسی قواعد کی پابند نہیں۔ اخبار کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر اس کی منزلوں کا تعین کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں اسی حساب سے الفاظ کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے۔

تحیرآمیز ابتدائیہ(Wonderfull Lead): یہ ابتدائیہ بظاہر ناقابلِ یقین بیانات پر مشتمل ہوتا ہے جس کا مقصد قاری کے تجسس کو اور تیز کرنا ہوتا ہے۔

نور جہاں ثروت

اردو صحافت میں اداریہ نگاری کی اہمیت

اداریہ کو اخبار کی ناک کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں حالات حاضرہ، صورت واقعہ اور زاویہ نگاہ پر خصوصی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اخبار کی صحافتی، ادبی اور قومی ذمہ داریوں سے بھی اس کا گہرا رشتہ ہے۔ اس اعتبار سے اخبار کی اہمیت جہاں خبروں سے وابستہ ہوتی ہے اور عام واقفیت یا خصوصی حالات کے لیے اخبارات کے صفحات اور کالم پڑھے جاتے ہیں وہاں جو لوگ اخبار سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اداریہ کا مطالعہ خصوصیت سے کرتے ہیں کہ کام یا پتے کی بات انھیں وہیں ملتی ہے۔

اخبارات مختلف مقاصد کے تحت نکلتے ہیں۔ ان میں ایک بڑا مقصد عوام اور بعض صورتوں میں خواص کی ملی، قومی، سیاسی، مذہبی اور عالمی مسائل پر رہنمائی بھی ہوتی ہے۔ بالعموم اخبارات کسی خاص جماعت گروہ یا سیاسی تنظیم کی ترجمانی کے لیے نکلتے ہیں ان میں وہ اخبار بھی ہوتے ہیں جو بائیں بازو کی پارٹیوں کی طرف سے نکلتے ہیں اور اختلافی نقطۂ نظر کو موقع بموقع سامنے لاتے ہیں اور وہ اخبار بھی ہوتے ہیں جو حکومت کی تائید میں اپنی زبان قلم کو جنبش دیتے ہیں۔ یہ کوئی غلط بات نہیں بشرطیکہ اس پس منظر میں شخصی عناد یا ذاتی مفاد شامل نہ ہو۔ ہمارے مقاصد کی بلندی، پستی، قومی شعور کی تابنا کی

وتاریکی اور اسی کے ساتھ تاریخ پر نظر داری اخبارات کی پالیسی کے تعین میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اداریہ اسی لیے رہنمائی کا باعث بنتا ہے کہ وہ اس شخص کی قلم سے ہوتا ہے جس کی خبر و نظر کی سطح سے قارئین کم و بیش واقف ہوتے ہیں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ جس کا نام بحیثیت مدیر اعلیٰ آرہا ہے اس کو نہ خود پر اعتبار ہے اور نہ اپنے قلم پر مگر اپنے نام کو وہ اس سانچے میں ضرور ڈھالنا چاہتا ہے۔ بہت سے مصنفین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے یہاں تک کہ ہمارے بعض اہل قلم اور اہل علم بھی وہ ہیں جن کے ذہنی سرمایے میں بہت سی باتیں ان کی اپنی نہیں ہیں، دوسروں کی دین ہیں۔

بعض اخبار ملکی حالات پر زیادہ زور دیتے ہیں بعض غیر ملکی معاملات اور مسائل کو زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ بات ان کی پالیسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اخبارات کے ساتھ ایک مشکل اور بھی ہے کہ ان کے خریدار یا بہی خواہ کس طبقہ سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں؟ وہ ان ہی کی تائید کرتے ہیں اور ان ہی کے حق میں اداریے لکھتے ہیں۔ جب ہم اردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے اخبارات بطور خاص کسی خاص طبقے میں مقبول ہوتے نظر آتے ہیں جو غیر معمولی ذہانت اور منفرد انداز نگارش کے مالک ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں دہلی اردو اخبار، اس کے بعد تہذیب الاخلاق بعد میں زمیندار، الہلال، اور علی گڑھ گزٹ اسی طرح کے اخبارات میں الجمعیت اور مدینہ جیسے اخبارات بھی اپنے مدیروں کی وجہ سے زیادہ پسند کیے گئے۔ اور ان سے وابستگی خود ان کے مدیروں کے لیے بھی وجہ شہرت وافتخار بنی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' یا بعد میں ''البلاغ'' اور مولانا محمد علی جوہر کا ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' اسی دائرہ میں آتے ہیں۔ ظفر علی خاں کے اداریوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان ارباب صحافت کے وسیلے سے ہمارے صحافت کی ایک ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بن گئی۔

یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اداریہ نگاری کی ٹکنیک کیا ہے۔ اداریہ نگاری ادبی و صحافتی فن کے اعتبار سے وقت کے تقاضوں سے وابستہ رہی ہے۔ ہم ایسے اداریے بھی

دیکھتے ہیں جو بڑی شخصیتوں کی وفات پر لکھے گئے۔ سرسید نے مولانا قاسم نانوتوی کی وفات پر جو اداریہ لکھا تھا، وہ خاصے کی چیز تھا حالانکہ دونوں میں سخت اختلاف تھا لیکن مولانا کی وفات پر جب سرسید لکھنے بیٹھے تو انھوں نے مولانا کی ایک ایک خوبی کو سراہا اس سے مولانا کے عظیم کردار کے ساتھ ساتھ سرسید کے پر عظمت کردار کے روشن پہلو بھی سامنے آئے۔

اداریہ نگار کو اپنی فکر ونظر کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑنی چاہئیں۔ ممکن ہے اس کی کوئی بات وقتی طور پر بہت اچھی لگے لیکن اگر اس میں سوجھ بوجھ کی کمی ہے اور وہ توازن سے محروم ہے تو اس پر لکھے اداریے کی حیثیت دیواروں پر چسپاں اشتہاروں کی سی ہوجائے گی۔ اگر مسائل زیادہ ہوں تو ایک اداریے کے ساتھ ذیلی اداریے بھی ہوتے ہیں مگر ان کا چلن اردو میں عام نہیں ہے۔ اس لیے کہ اردو اخبارات میں ایڈیٹوریل ٹیم نہیں ہوتی ایڈیٹر خود ہی عنوان طے کرتا ہے خود ہی اداریہ لکھتا ہے۔ انگریزی اخبارات میں تین تین اڈیٹوریل ہوتے ہیں جو ٹیم کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ ایڈیٹر ان میں کتر بیونت کرتا ہے مگر وہ تضاد سے عاری ہوتے ہیں۔

صحافت کی زبان اگرچہ غیر معمولی سطح پر ادبی زبان نہیں ہوتی کیونکہ اس کا رشتہ عوام سے ہوتا ہے۔ پڑھنے والوں میں ایک ہی شعبہ زندگی کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ الگ الگ محکموں، طبقوں اور پیشہ ورانہ دائروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اداریوں کی زبان مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ شاعرانہ یا خطیبانہ بھی نہیں، جذباتی لب ولہجہ یا بہت عامیانہ وعمومی فقرے اداریوں میں اچھے نہیں لگتے۔ معاصر رویوں پر بھی تنقید ہونی چاہیے۔ جس میں شخصی شعور کو تو دخل ہونا چاہیے مگر شخصی مفاد کو نہیں کہ اس سے اخبار کا وزن اور وقار سنجیدہ پڑھنے والوں کی نظر میں باقی نہیں رہتا۔ سستی شہرت نہ پر وقار شخصیتوں کا حصہ ہونا چاہیے اور نہ اداروں اور اداریوں کا ـــ

یہاں میں مختصراً چند باتیں اور کہنا چاہوں گی ـــ اردو اخباروں کے اداریوں کی اہمیت انگریزی اخباروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ تیس سے چالیس فیصد قاری

خبروں سے پہلے اداریے پڑھتے ہیں۔اردو اخبارات قوم کی رہنمائی بھی کرتے ہیں اور یہ کام اداریہ کے ذریعہ ہی ہوتا ہے— آپ دیکھتے ہوں گے کہ بعض اردو اخبارات کے اداریے دوسرے اخبارات کے اداریوں سے بہتر ہوتے ہیں، جو مدیر جتنا زیادہ قابل ہوگا جسے قومی اور بین الاقوامی مسائل سے زیادہ واقفیت ہوگی جو مختلف مسائل پر خود نقطۂ نظر رکھتا ہوگا جسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہوگی وہ اتنا ہی بہتر اداریہ لکھے گا۔علمی وادبی پس منظر رکھنے والے ایڈیٹر زیادہ کامیاب اداریہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔

- اداریہ نگار کو چاہیے کہ وہ جس خبر یا واقعہ کو اداریہ کا موضوع بنائے پہلے اس سے متعلق تمام معلومات جمع کرلے۔آج تو کمپیوٹر نے اس مسئلہ کو بہت آسان کردیا ہے۔ورنہ اردو اخبارات میں تو اخباری لائبریریوں کا بھی فقدان ہے جہاں موضوعاتی کلپنگ رکھی ہوتی ہیں یا ان موضوعات پر کتابیں اور انسائیکلو پیڈیا ہوتے ہیں مگر اردو کا مدیر اپنی یادداشت کے سہارے چلتا ہے اس لیے بعض اوقات پائے کی غلطیاں بھی سرزد ہوجاتی ہیں۔
- اردو اخبارات کے بیشتر قارئین مسلمان ہوتے ہیں اس لیے مدیر کے لیے موضوعات کی اہمیت مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ہی ہوتی ہے مثال کے طور پر کچھ دنوں قبل ہری کوٹا کی ISRO تجربہ گاہ میں آگ لگی اسی دن عارف محمد خاں بی جے پی میں شامل ہوئے اور سونیا گاندھی کو نجمہ ہبت اللہ نے کھری کھوٹی سنائیں،اردو والوں کے لیے یہ دوسرا مطالعہ زیادہ اہم اور اداراتی موضوع تھا۔
- اداریہ لکھتے وقت ہر لفظ کو سوچ سمجھ کر منتخب کرنا چاہیے اداریوں کی زبان جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے آسان ہونی چاہیے لیکن سینکڑوں بار کے گھسے پٹے جملوں سے گریز کرنا چاہیے مثال کے طور پر اگر کسی بڑے لیڈر، ادیب یا سائنسداں کی موت پر اداریہ لکھا جارہا ہے تو اس کا عنوان ''آج وہ کل ہماری باری ہے'' نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ مصرعہ بارہا استعمال کیا گیا ہے۔
- اچھا اداریہ نگار کبھی کبھی لفظوں سے کھیلتا بھی ہے۔اس سلسلے میں خود اپنے اخبار

'انقلاب' کی مثال دینا چاہوں گی۔ کچھ سال پہلے جب تسلیمہ نسرین نے ڈھاکہ کی ایک عدالت میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے معافی طلب کی تھی تو انقلاب میں شائع ہونے والے اداریہ کا عنوان ''سر تسلیم خم ہے'' تھا۔ مشہور شہنائی نواز بسم اللہ خاں کو بھارت رتن ایوارڈ ملنے پر ایک اداریہ ''گونج اٹھی شہنائی'' کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔ خلیجی جنگ کے بعد عراق میں امریکی صدر جارج بش کو جو مشکلات درپیش ہیں ان کے مدِ نظر ایک اداریہ ''جھاڑیوں میں پھنسے ہوئے بش'' میں لفظی کھیل یعنی Pun (پَن) ہے کہ اردو میں بش کے معنی جھاڑی کے ہوتے ہیں۔

- بعض اوقات اخبار میں کوئی اہم خبر کسی وجہ سے شائع نہیں ہو پاتی اس غلطی کی تلافی دوسرے دن اس پر اداریہ لکھ کر کر دی جاتی ہے۔
- اداریہ نگاری میں علاقائی اہمیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر الجیریا یا ترکی میں زلزلہ کی وجہ سے پانچ ہزار افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسی دن دہلی، ممبئی یا کسی دوسرے شہر میں ہونے والے بم دھماکے میں پچاس افراد کی جان چلی جاتی ہے تو ہمارے نزدیک ۵۰۰۰ کے مقابلہ میں ۵۰ ہندستانیوں کی جانیں زیادہ قیمتی ہیں اس دن کے اداریہ کا موضوع یہی ہو سکتا ہے۔
- ادارتی کالم کی طوالت چونکہ طے ہوتی ہے اور اداریہ نگار اپنی مرضی سے اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا اس لیے زیادہ سے زیادہ حقائق کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنا ہوتا ہے، اسے ہی اردو میں ایجاز و اختصار کہتے ہیں اداریہ مختصر مگر مکمل ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر خاور ہاشمی

اردو اخبارات کی صورت حال، مسائل اور حل

اردو زبان ،اردو ادب اور اردو صحافت فی زمانہ تحریر وتقریر کا نہایت دلچسپ موضوع بن چکے ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے زوال کی علامت بھی ہے اور زندہ رہنے کی آرزو بھی — مرثیہ گوئی اور قصیدہ نگاری کے ساتھ ہی نعرۂ تکبیر بھی ہماری روایت اور مزاج کا ایک حصہ رہا ہے اور شاید یہی مزاج ہماری زندگی کی ضمانت ہے۔ عجیب حال یہ ہے کہ زمانہ ہمیں جینے نہیں دیتا اور سخت جانی ہمیں مرنے نہیں دیتی۔ اردو زبان، اس کی ثقافت اور صحافت کے مسائل اور وسائل پر بحث وگفتگو، تبادلہ خیال اور جلسوں سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، اس سے ایک ثبوت ضرور ملتا ہے کہ ان مسائل کے چکر ویوہ سے نکلنے کی طلب وتمنا ہمیں بیتاب کئے ہوئے ہے۔ ان جلسوں اور سیمناروں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اردو کے وجود کا احساس ہمارے سماج میں برابر تازہ ہوتا رہتا ہے اور اپنی زبان، ثقافت اور صحافت سے اردو والوں کے تعلق میں توانائی اور تجدید ہوتی رہتی ہے۔ ''اردو والوں'' کی اصطلاح بھی خوب ہے۔ ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے اردو والوں سے مراد ہندستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ ہے لیکن پھر بھی ہم مسلمانوں کو اردو والے ہی کہتے

ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری بھی اردو زبان پر ہی ہے۔ اشاروں، کنایوں اور علامتوں کا جو عظیم الشان ذخیرہ اردو کے دامن میں محفوظ ہے وہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔ اسی لیے ہم اشاروں کنایوں میں اظہار خیال کے عادی ہیں، دوسرے یہ کہ اردو زبان کا مزاج ہر قسم کی فرقہ پرستی اور عصبیت سے پاک ہے اس لیے ہم اردو والوں کو مسلمان کہنے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں اردو کے پاک اور صاف شفاف دامن پر فرقہ پرستی کا بدنما دھبہ نہ لگ جائے۔ علامتی زبان میں بولنے اور لکھنے کا ایک بنیادی فائدہ بھی ہے۔ گل وبلبل کی آڑ میں بلا خوف بولتے اور لکھتے رہئے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون گل وبلبل پر نافذ نہیں ہوتا، انسانوں پر ہوتا ہے۔ ہندو مسلمان کے تعلق سے کوئی بات کرنا میرے نزدیک فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اور پھر تذکرہ جہاں اردو صحافت کے مسائل کا ہو تو ''بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر۔''

ہندستان میں اردو صحافت کا حال نرالا بھی ہے اور نا قابلِ فہم بھی۔ اردو کی ریڈرشپ جیسے جیسے محدود ہوتی جارہی ہے اسی تناسب سے اردو اخباروں اور جرائد کی اشاعت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اردو میں جتنے اخبار اور جریدے آج شائع ہورہے ہیں ہندستان کی تاریخ میں اتنے کبھی نہیں ہوئے۔ اردو داں طبقے میں اردو کے تہذیبی پس منظر اور ثقافت کی لاعلمی کی وجہ سے ادب وشاعری تو اردو داں طبقے کی تفہیم کی رسائی سے باہر ہو چکے ہیں۔ اس لیے اردو داں طبقہ اردو اخبار وجرائد کے مطالعہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو پریس ہی میں اسے اپنے جذبات اور مسائل کی ترجمانی اس سادہ زبان میں ملتی ہے جسے وہ خوب سمجھتا ہے۔ اردو لائبریریوں کا یہ تکلیف دہ اشتہار کبھی کبھی اردو اخباروں میں نظر سے گذرتا ہے کہ لائبریری میں اردو کتابیں گرد آلود اور دیمک کی غذا بنتی جارہی ہیں کوئی پڑھنے والا نہیں ہے لیکن ایسا کوئی اشتہار نظر سے نہیں گذرا اردو اخبارات ورسائل پڑھنے والے لائبریری میں نہیں آتے۔ اس لیے یہ دعوی بے دلیل نہیں ہے کہ اردو والوں کا رشتہ اردو کے ساتھ اردو اخباروں کے دم سے قائم ہے۔ مشاعروں میں بھی اکثر سامعین تفریح طبع کے لیے جاتے ہیں شعر فہمی کے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو

کے اس دورِ زوال میں بھی دہلی ،ممبئی ،حیدرآباد، بنگلور،اورنگ آباد، جالندھر،کلکتہ اور ملک کے بعض دوسرے مراکز سے ایسے مقبول عام، معیاری اور کثیرالاشاعت اردو اخبارات شائع ہورہے ہیں جنھیں قومی پریس کے مقابلے میں بلا تکلف رکھا جاسکتا ہے۔ عام صحافت کی طرح اردو صحافت کا براہ راست تعلق سیاست اور قیادت سے ہے۔ سیاست اورقیادت ہماری سماجی، معاشی، قومی اور فکری زندگی کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قومی رہنماؤں میں اکثر نے اپنے مشن کی ابتداء صحافت سے کی۔ اردو صحافت کے تعلق سے مولانا آزاد کا نام نامی اسم گرامی سب سے نمایاں اور ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ آج بھی اردو والوں کی محرومیوں، ناکامیوں، آرزومندیوں، حق تلفیوں کی موثر اور دلکش ترجمانی اوروکالت کے فرائض اردو صحافت ہی انجام دے رہی ہے۔ قومی قیادت کی ہر سطح پراردو والوں کارجحان اور اندازِ فکر جاننے اور سمجھنے کے لیے اردوصحافت ہی سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس لیے اردو صحافت آج بھی اپنی تمام تر کمزوریوں اورمحرومیوں کے باوجود سماج کے کمزور طبقوں کا ایک بڑا سہارا ہے۔ جہاں تک مواد اور پالیسی کا تعلق، اردو اخبارات پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان اخبارات میں جذباتی موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ الزام یقیناً صحیح ہے لیکن بلا سبب نہیں ہے۔ آزادی کے بعد اردو پریس کو اس طبقہ کی ترجمانی کے فرائض تفویض ہوئے جو مسلسل عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رہا اور آج بھی ہے۔ اس طبقہ کے سامنے جان ومال، عزت و آبرو، عقائد اورایمان کے تحفظ اوراپنی لسانی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کا ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ اس صورت حال کے اسباب کی تفصیل طویل ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اردو اخباروں کے قارئین کو معاشی اور تعلیمی محرومی کے باوجود جس کیفیت نے اس عرصہ میں زندہ رکھا اس کیفیت کو جذباتیت کے سوا کوئی عنوان نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ اردو اخبارات کی یہ مجبوری اور ضرورت رہی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو زندہ رکھنے کے لیے اس کیفیت کی ترجمانی کریں۔ اس کے باوجود اردو اخباروں کے کالم معاشی، قومی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی موضوعات پر نہایت مدلل معیاری

اور صحت مند نقطۂ نظر کے حامل تبصروں اورتحریروں سے بالکل ہی خالی نہیں رہے۔ ہر اخبار اپنے قارئین کے جذبات واحساسات کا خاص خیال رکھتا ہے،اردواخباروں نے بھی اس کا خیال رکھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جہاں پورا سیاسی نظام جذباتیت پر چل رہا ہو وہاں محض اردواخباروں پر جذباتی ہونے کا الزام مناسب اورقرین انصاف نہیں ہے۔

اردو اخباروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ انھیں جاری اور زندہ رکھنے کا مسئلہ ہے۔ایک عام اردو صحافی صبح سے شام تک اپنی اوراپنے اخبار کی غذا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔پھر اخبار کے لیے مواد کی فراہمی کتابت وطباعت اور پھر قارئین تک اسے پہنچانے کی جان لیوا محنت بھی اسے جھیلنا پڑتی ہے کیونکہ مناسب وسائل اسے میسر نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ اردواخباروں کوسرکاری سرپرستی، حوصلہ افزائی کسی دور میں اتنی نہیں ملی جتنی آج مل رہی ہے۔شکوہ یہ ہے کہ یہ حوصلہ افزائی اردواخباروں کی ضرورت اوران کے جائز حق سے کم ہے۔ڈی اے وی پی میں اردو اخباروں کے اشتہارات کی شرح سب سے کم رکھی جاتی ہے۔نیم سرکاری اداروں تک اردو اخباروں کی رسائی نہیں ہے۔اس کے علاوہ پرائیویٹ سیکٹر سے انھیں برائے نام بھی حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔ اردو اخباروں کا دوسرا اہم مسئلہ روز بروز محدود سے محدود تر ہوتی ہوئی ریڈرشپ ہے۔ اردو زبان کی تعلیم کا نظام درہم برہم ہوجانے کی وجہ سے اردوریڈرشپ پر بہت برا اثر پڑا ہے۔غیر سرکاری اسکولوں میں بھی اردو تعلیم کی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ سرکاری سطح پراردو اخباروں کی حوصلہ افزائی میں اضافہ، پرائیویٹ سیکٹر سے اردواخباروں کے تعاون کا لین دین اور اردو تعلیم کے نظام کی تشکیل نو اورروزگار سے اس کا تعلق ہمارے بنیادی مسائل کا حل ہے۔

مسائل کوحل کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔اردو اخبار نویسوں کو پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ اردو پریس قومی زندگی میں کیا کردار ادا کررہا ہے۔اس کردار کا تعین اس کے حل میں معاون ثابت ہوگا۔ایک طرف اردواخباروں کے معیار

کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور افادی بنانے کی کوشش اور دوسری طرف اردو قارئین کی معاشی و تعلیمی ترقی اردو اخباروں کے مسائل کا پائدار حل فراہم کر سکتی ہے۔

فرحت احساس

صحافت: پیشہ یا مشن

ادب اور صحافت دونوں ہی لفظ کی طاقت کو پہچاننے اور انھیں اظہار کا وسیلہ بنانے کی شکلیں ہیں۔ دوسروں سے ہم کلام ہونا اور باخبر کرنا دونوں کے وظائف خاص میں شامل ہے۔ انسانی اظہار کی قدیم ترین صورتوں میں خواہ وہ مصوری ہو یا رقص، موسیقی ہو یا مجسمہ سازی یا شاعری یہ دونوں پہلو کسی نہ کسی طور پر نمایاں رہے ہیں۔ تمام فنون لطیفہ کو ایک برتر اور وسیع تر معنی میں صحافت کی قدیم ترین صورتوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ماقبل لفظ عہد میں تہذیبی سفر کے دوران جب خیالات مرتب اور مربوط نہیں ہوئے یا ہو سکتے تھے۔ آوازیں، لکیریں اور جسمانی حرکات وسکنات ہی اظہار اور شرکت کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ لفظ کے دسترس میں آتے ہی جب انسان نے شعر کو اظہار وکلام کا وسیلہ بنایا ہے تو اس میں بھی صحافت کے بنیادی محرکات کے عکس تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ شاعری یا دیگر ادبی اظہارات، ذاتی وجدان، تخیل، لفظ کے تخلیقی استعمال اور خارجی حقیقت کی ذاتی یا باطنی تشکیل نو کے عمل سے گذرتے ہوئے ایک بلند تر سطح پر جا پہنچتے ہیں جب کہ صحافت اپنی عمومی تعریف میں اطلاع رسانی خیالات

یا نقطۂ نظر کے راست اظہار،صورت حال کے تجزیے، حالات وواقعات پر تبصرے نقطۂ نظر کے مطابق اخذ نتائج اقداری فیصلوں اور قارئین کو اثر انداز کرنے کی تمام ممکن کوششوں سے عبارت ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ماقبل جدید زمانوں میں جب انسانوں کو لفظ کی راست، نثری اور صحافیانہ قوت باضابطہ طور پر میسر نہیں آئی تھی تو حالات حاضرہ پر ردعمل ،ان کے تجزیے اور تبصرے اور اظہار خیال کی اور باخبر کرنے کی فطری جبلت شاعری کی مختلف بیانیہ اصناف ،رقعہ نگاری اور تاریخ نویسی وغیرہ کی صورتوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ یہ بیانیہ اصناف کے شاعر، رقعہ نگار اور تاریخ نویس دراصل اپنے زمانے کے ایسے افراد تھے جو کسی نہ کسی صورت میں صحافی کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ چھاپہ خانے کی ایجاد اور رواج کے بعد یہی افراد تاریخ کے اولین باضابطہ صحافی ہوئے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو صحافت کا آغاز ادب یا ادبی اظہار کی ایک شق کے طور پر ہوا تھا اور اس لحاظ سے اسے ذاتی اظہار کی حیثیت حاصل تھی۔ صحافی ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو اپنے آپ کو اپنے معاشرے اور وقت کے حالات وواقعات اور ان کی سمت ورفتار سے باخبر رہنے اور رکھنے اور اس بارے میں اپنی رائے دینے کے منصب پر فائز سمجھتا تھا۔ یہ ایک سماجی اور تہذیبی ذمہ داری کے احساس اور اس سے عہد برآ ہونے کا منصب تھا۔ یہ احساس خود زائیدہ تھا اور یہ منصب خود حاصل کردہ تھا۔ اس میں اس کے اصل اور بنیادی محرک کے سوا کوئی خارجی عوامل شاید ہی کارفرما رہتا تھا۔ اسی وجہ سے صحافی کو ایک سماجی اور اخلاقی سمت نما اور رہنما کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی۔

جیسے جیسے معاشرہ زیادہ منظم ہوتا گیا اور اس کی مختلف سرگرمیوں میں تنوع ،تنظیم اور پیچیدگی پیدا ہوتی گئی، واقعات کا سلسلہ تیز ہوا۔ معاشرے کے مختلف امراء اور طبقوں کا باہمی تعامل تضاد اور تصادم کی منزل میں داخل ہوا اور نئی نئی خواہشوں ،تمناؤں اور آرزوؤں نے سر ابھارا ویسے ویسے صحافت کی صورت، نوعیت اور اس کے وظائف و افعال میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔ لیکن صحافت اب بھی بہت عمومی اور بڑی حد تک اور

اپنی غالب حیثیت میں شخصی اظہار کا وسیلہ ہی تھی۔

ہندستان میں بھی صحافت کا آغاز اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ ۱۹ ویں صدی میں صحافیانہ سرگرمیوں کے آغاز کے بعد ۲۰ ویں صدی میں جب ملک کے سماجی اور سیاسی حالات ایک شدید اتھل پتھل کی گرفت میں آچکے تھے صحافت کے شخصی اظہار کی صورتیں بے انتہا بلیغ الدماغ ،فصیح القلب ، وسیع الشعور،قوی الفکر، جری الاظہار اور راسخ القلم افراد کی ایک تابناک کہکشاں بن کر ظاہر ہوئیں۔ ملک کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں اردو ابوالکلام آزاد ، محمد علی جوہر ،ظفر علی خاں جیسے بے شمار افراد نظر آتے ہیں جن کی شخصیت کا ایک حصہ صحافی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دراصل ان کی ذاتی حیثیت کا یہ صحافیانہ حصہ ہی ان کی اجتماعی شخصیت کی تشکیلی بنیاد تھا۔ صحافت ان کے لیے ایک شخصی اظہار کا وسیلہ اور وہ سب کچھ تھی جسے وسیع تر معنی میں مشن کہا جاتا ہے یعنی ایک خواب ، ایک آدرش، ایک غالب خیال اور نصب العین کے تعاقب اور حصول کے لیے اپنی ساری زندگی کو وقف کر دینا ۔ایسے تمام افراد نے اخبار جاری کیے۔ جو اور کچھ نہیں ان کی اپنی ہی ذہنی، اخلاقی دنیا کے جز اور احوال نامے تھے۔ یہ ان کے وہ ہرکارے تھے جنھیں وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنے افکار و جذبات کے تئیں بیدار کرنے کو روانہ کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ اخبار ایک ذہنی سرگرمی کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی سرگرمی بھی ہوتا ہے مگر ان افراد کے لیے اقتصادی پہلو، ذہنی، اخلاقی پہلو کے ماتحت تھا اور اسی لیے اخبار اکثر و بیشتر ان کے لیے مالی نقصان کا سودا ہوا کرتا تھا۔ ایسا نقصان جو ان کے باطنی فروغ کا باعث تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ اس زمانے کے تمام اخبارات میں تجارتی پہلو کو سراسر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ''زمانہ'' کانپور اور ''مدینہ'' بجنور جیسے اخبارات اس پہلو سے بھی مضبوط تھے مگر ان میں بھی کہیں نہ کہیں ایک غیر از مادی نصب العین تھا جو خالص مالی مقاصد پر غالب رہتا تھا۔

اس کے کئی اسباب کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جب فضا میں رومان انگیز عینیت پسندی کے رنگ حاوی تھے اور بڑی تعداد میں ایسے

افراد کا ہونا ممکن تھا جو اپنے آدرش اور نصب العین کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردیں۔ دوسرے یہ کہ صحافت ابھی تک عموماً ایک پیشہ نہیں بنی تھی۔ پیشہ یعنی وہ مخصوص ماہرانہ صلاحیت مندی جس کا اپنا کوئی ذاتی آدرش یا نصب العین نہ ہو اور جو مالی منفعت کے بدلے کسی کے بھی زیر استعمال لائے جانے کے لیے آزاد اور آمادہ ہو۔ مارکسی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو صحافت کی دنیا میں سرمائے کو ابھی خودمختار رعونت حاصل نہیں ہوئی تھی اور اخبار ایک ایسی پیداواری اکائی ہوتا تھا جہاں محنت کی برگشتگی alienation of labour کا گذر ہونا باقی تھا۔ یعنی پیداوار اور صارف میں ناقابل عبور فاصلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ پیدا کار اور صارف کے درمیان ایک اشتراک کار اور بقائے باہم کا رشتہ استوار تھا۔

سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ہمارے ہاں جہاں بہت کچھ بلکہ سب کچھ بدلنے لگا تو صحافت میں تبدیلی آئی۔ آزادی حاصل ہوتے ہی جو چیز سب سے پہلے رخصت ہوئی وہ تھی عینیت پسندی اور بےلوث خدمت۔ بڑا سرمایہ جو کب سے صحافت کے در پر دستکیں دے رہا تھا بالآخر بار پانے میں کامیاب ہوا۔ صحافی جو ایک عرصے سے اپنے ذہن و قلم کا ایک خودمختار کارکن تھا رفتہ رفتہ اپنی تجارتی فروخت یعنی پیشہ ور ہونے پر راضی ہوگیا۔ اخبار نے اب ایک تجارتی تنظیم کی شکل اختیار کرلی جس کا بنیادی محرک اور مقصد حصول زر تھا۔ مالک اگر مدیر نہیں ہے جو اخبار کا مدیر اور دیگر تمام ادارتی کارکن با تنخواہ ملازم ہونے لگے یعنی صحافت کا ذہن صحافت کے تاجرانہ مقاصد سے الگ اور ان کے تابع ہوگیا۔ اگرچہ بڑے اخباروں میں ادارتی آزادی اور خودمختاری کا اصول تسلیم کرلیا گیا۔ اور بعض جلیل الضمیر مدیروں نے اپنے اس حق کا پوری شدت سے اثبات بھی کیا مگر ادارتی خودمختاری اور ملکیت کے مفادات میں جب بھی تصادم ہوا تو فیصلہ اکثر و بیشتر ثانی الذکر کے حق میں ہی ہوا۔

آج انگریزی، ہندی اور دیگر اہم زبانوں کے بیشتر بڑے اخباری ادارے (یہاں بڑے سے مراد سیرت نہیں صورت ہے) بنیادی طور پر تجارتی تنظیمیں ہیں جو

صحافت کو خام مال کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ یہ اخبار اعلیٰ ترین ذہنی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے تجارتی مصنوعات Products کے طور پر تیار کیے جاتے ہیں جن میں خبریں، تجزیے اور تبصرے اشیائے صرف کا حکم رکھتی ہیں۔ سارے خیالات اور نظریات، جذبے اور جبلتیں، خواہشیں اور آرزوئیں صلاحیت فروخت کے مطابق استعمال کی جاتی ہیں۔ جمہوریت نوازی ہو یا جبر پسندی، سیکولر اقدار ہوں یا فرقہ وارانہ زہر، جنسی تلذذ ہو یا جرائم کی تھرتھری جو چیز جب، جہاں اور جس طرح زیادہ بکتی ہے بیچی جاتی ہے۔

اردو صحافت کی دنیا بڑے سرمایے کی دست رس، رسائی یا مداخلت سے دور ہونے اور اردو زبان کی مخصوص صورت حال کے باعث ابھی پوری طرح تجارتی سرگرمی کی مڑگا نہیں بن سکی ہے۔ اور آئندہ جہاں تک نظر جاتی ہے ایسا ہوتا دکھائی بھی نہیں دیتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اخبارات شخصی اظہار یا مشن کے طور پر چلائے جارہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا بنیادی محرک اور مقصد تاجرانہ ہی ہے۔ بیشتر نمایاں اردو اخبارات کا مالک اور مدیر ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ اور اس کا اخبار عموماً اس کے ذاتی مفادات کے حصول کا وسیلہ ہوتا ہے۔ کھلے بازار کی قوتوں سے کٹے ہونے کے سبب ان اخبارات کو اپنی بقا کے لیے بنیادی طور پر صرف اپنے پڑھنے والوں کی تعداد پر منحصر ہونا پڑتا ہے۔ اور پڑھنے والے چوں کہ ایک مخصوص فرقے اور طبقے کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے ان کے صفحات میں موضوعات کا تنوع بھی کم یاب ہوتا ہے۔ پھر پڑھنے والوں کی تعداد اور قوت خرید بھی کتنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اردو اخبارات کو ایک خاص قسم کی مسلم جذباتیت کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ قلیل تر ہوتے ہوئے قارئین کو کسی نہ کسی طرح باندھے جوڑے رکھا جا سکے۔

اب انسانی تہذیب تاریخی ارتقاء کے جس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے وہاں سے آگے ساری دنیا اب محض ایک بازار ہے اور یہ بازار پھیلتا جا رہا ہے۔ انسانوں کے باہر بھی اور اندر بھی اور اس بازار میں انسانی زندگی کے تمام مظاہر، تمام خیالات وافکار،

جذبے اور آرزوئیں، قدریں اور معیار، مذاہب اور نظریات محض اشیائے صرف ہیں۔ اس بازار میں کوئی بھی پھل پھول سکتا ہے جب وہ ایک برانڈ ہو اور خالص و محض انسان ہونا کبھی ایک برانڈ نہیں بن سکتا کہ اسے اقتصادیات یا مینجمنٹ کے کسی اصول میں باندھنا ممکن نہیں۔ تمام اپنے آپ میں اور آپ سے ہونے والے انسان اور خواب دیکھنے والے انسان اب زندگی کے مضافات ہی میں رہ سکیں گے۔ اور انھیں دنیا کے حاشیے پر رہ کر ہی کہیں انسان کے بچے ہونے کی گواہی دیتے رہنے کی جدوجہد رکھنی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد نعمان

اردو اخبارات میں زبان کا معیار

زبان کی تشکیل، تعمیر اور ترقی، تغیر پذیر عمل ہے۔ اردو زبان کی موجودہ صورت صدیوں کے علمی، تہذیبی اور تمدنی سفر ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کی ترقی، ترویج و اشاعت میں قرآنی تراجم، تفاسیر، تصوفانہ رسائل، حکایات اور داستانوں کے ساتھ اخبارات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو نثر کو مقبول عام بنانے، دور دراز تک پہنچانے اور ارتقائی عمل سے ہمکنار کرنے میں اردو اخبارات کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

تلاش و جستجو، سرشت انسانی کا خاصہ ہے۔ خبر گیری اور خبر رسانی کا عمل عہد عتیق سے جاری ہے، چنانچہ جب نطق کو تحریر کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا یا تحریر وطباعت کی سہولتیں مہیا نہ تھیں، تب بھی خبریں بنتی اور پھیلتی تھیں۔ شلیے کے مطابق:

> ''... یہ اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی جب انسان نے سماجی زندگی کی ابتداء کی تھی۔ اس وقت سے لوگ ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے گئے تو خیالات کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ

خیالات الفاظ یا زبان کے ذریعے ایک سے دوسرے آدمی
تک پہنچتے تھے.....قاصد، نقیب، شعراء کرام، کلیسا کے پادری،
ڈھنڈورچی وغیرہ یہ سب ذرائع تھے جو اس وقت کے انسان
کو اطلاعات، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے لیے موجود
تھے۔'' [ماخوذ، ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر 1943]

تہذیبی ترقی کے ساتھ ذرائع ابلاغ کو فروغ حاصل ہوا۔ کالی داس کے میگھ دوت کی طرح مختلف النوع اشاراتی اور علاماتی ذرائع ابلاغ کی ایجاد عمل میں آئی۔ پریس کی ایجاد سے قبل، زبانی صحافت کے بعد قلمی پرچے جاری ہوئے۔ خبر رسانی کی اہمیت کے پیش نظر اخبارات کے اجراء نے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا۔ جمہوری نظام حکومت میں صحافت نے نہ صرف تجارت اور پیشے کی حیثیت اختیار کر لی بلکہ اسے اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی کہ جمہوریت کے چوتھے ستون سے تعبیر کیا جانے لگا۔

ماہرین ذرائع ابلاغ کا خیال ہے کہ خیالات کو عام کرنے اور متاثر کن بنانے میں اطلاع یا خبر کو خاص دخل حاصل ہے۔ اخبارات میں زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے کہ وہی اظہار کا وسیلہ ہے۔ اخبار کا معیار و مزاج اس کی زبان کے معیار پر منحصر ہوتا ہے۔ ماضی کے اردو اخبارات کی زبان کے معیاری ہونے کا انداز اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عام قارئین ان کے مطالعے سے اردو پڑھنا اور سمجھنا سیکھ جاتے تھے۔ اس طرح یہ اخبارات محض خبر رسانی اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان ہی فراہم نہیں کرتے تھے بلکہ ماحول سازی اور معلّمی کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

ابتدائی دور کے اردو اخبارات کے بیشتر مالکان اور مدیران باکمال شاعر و ادیب تھے اس لیے انھوں نے روزمرہ زندگی کے مسائل اور سیاسی سماجی حالات کی ترجمانی میں بھی زبان کے معیار کو ملحوظ رکھا بیشتر شعراء وادبا اخبارات سے وابستہ رہے کئی شعراء وادبا کی ادبی تربیت اخبارات نے ہی کی۔ جس کے سبب اہم کالم نویس، مورخ، شاعر، مزاح نگار اور انشا پرداز ابھر کر سامنے آئے اور اپنی اور اخبار کی شہرت اور مقبولیت

کا سبب بنے۔ اخبارات سے شعراء وادبا کی وابستگی نے زبان وادب کے معیار کو برقرار رکھا۔ یہ رجحان اس لیے بھی پروان چڑھا کہ اس عہد کے قارئین کا ادبی معیار، آج کے قارئین کے مقابلے میں قدرے بلند تھا۔ اردو صحافت کے ارتقاء پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم دور کے اردو اخبارات کی زبان اور اس عہد میں مروجہ معیاری ادبی زبان میں کوئی فرق نہیں تھا اور اخبارات اردو نثر کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے تھے۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی:

> ''...اردو اخبارات کا مطالعہ اس زبان کی تہذیبی اہمیت کو سمجھنے اور اس کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کے لیے غیر معمولی اہم ہیں۔ اردو نثر کے مراحل تمام تر نہیں تو بہت کچھ اخبارات کی خاموش خدمت کے وسیلے سے طے ہوئے ہیں۔'' [مقدمہ روح صحافت ص ج)

ابتدائی عہد کے اردو اخبارات کی زبان پر عربی فارسی زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر پہلا اردو اخبار'' جام جہاں نما'' (کلکتہ) کی خبر کی پر تصنع زبان ملاحظہ کیجیے:

> ''لکھنؤ کی خبر۔ غلام حسین داروغہ کو حضرت بادشاہ کی طرف سے ارشاد ہوا ہے کہ للو مل مودی اور چمن لال مشرف، باورچی خانے کا مقید ہو۔ آخر ان دونوں نے اپنے قصور کا اقرار کیا اور اپنی غفلت پر نادم ہوئے اور پانچ ہزار روپے احتقانے کے گزارنے، بادشاہ خطا بخش نے خطا معاف فرمائی۔'' [''جام جہاں نما'' کلکتہ 29 دسمبر 1842]

معروف اخبار'' دہلی اردو اخبار'' کی یہ خبر بھی ہماری بات کی تصدیق کرتی ہے ملاحظہ کیجیے:

> ''ان دنوں اس شہر میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا کہ دیکھنے اوس

> کے سے پٹا آدمیوں کا پانی ہو گیا ہے یعنی ایک روز وقت
> بارش، باران رحمت الٰہی ، یکا یک رعد خروش میں آیا اور بجلی
> باروت خانے میں سرکار کمپنی کے پڑی۔ خانے کو یک بارگی
> بیخ وبن سے اکھاڑ کے ایسا ہوا میں پھینکا کہ سنگ وخشت اوس
> کی سے کچھ نظر نہ آیا، صدمہ اوس کے سے صدہا مکان، رفیع
> الشان، قرب وجوار باروت خانے کے جڑ سے اوکھڑ کے
> گر پڑے اور تمام شہر میں زلزلہ عظیم پیدا ہوا''

یہ مثالیں بین ثبوت ہے کہ قدیم اردو اخبارات میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات وحادثات کو بھی مفرس اور معرب زبان میں، کہانی کے بطور قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا تھا۔ اس دور کے مذکورہ بالا دونوں اخبارات ہی نہیں بلکہ ان کے بعد شائع ہونے والے اردو اخبارات میں''مظہر حق''،'' سید الاخبار''، '' قرآن السعدین''، ''فوائد الشائقین''، ''صدر الاخبار''، عمدۃ الاخبار''،''جام جمشید''، ''مطلع الاخبار''،''کوہِ نور''،'' دریائے نور''،'' صادق الاخبار''،'' اودھ اخبار''،''اودھ پنچ''،''الہلال'' اور'' البلاغ'' وغیرہ سبھی اخبارات کی زبان مرصع، مسجع اور اعلا معیار کی حامل تھی۔ جب کہ جمہوری دور میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کی زبان کا معیار (بعض اخبارات کو چھوڑ کر) روبہ زوال ہے۔اس کی کئی وجوہ ہیں۔ جن میں صحافت کا صنعت بن جانا، اردو کو سرکاری سرپرستی سے محروم ہونا، وسائل اور سرمائے کی کمی، اردو قارئین کی کم ہوتی اور دیگر زبانوں کے اخبارات اوران کے قارئین کی بڑھتی تعداد ایسے کئی علل واسباب ہیں جو اردو اخبارات کی زبان کے معیار کو متاثر کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ زبان کے معیار کے زوال کا سبب محض صحافی ہی نہیں آج کا قاری بھی ہے کہ صحافتی مواد کسی مخصوص جماعت یا گروہ کا ترجمان نہیں ہوتا، پورے سماج کا عکاس ہوتا ہے اس لیے اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کم استعداد رکھنے والے افراد بھی اسے پڑھ اور سمجھ سکیں۔آج کی صحافتی زبان خیالات اور واقعات کی ترسیل کرتی ہے، جذبات

کی عکاسی نہیں کرتی اس لیے اس میں گہرے تخلیقی رچاؤ، فلسفیانہ نکات یا انشا پردازی کی شان کے بجائے سادگی اور سلاست ہوتی ہے۔ ہر خبر کی منفرد نوعیت ہوتی ہے اور مختلف نوعیت کی حامل خبروں کو مختلف انداز سے لکھنا ہوتا ہے۔ آج کے اخبارات کی زبان کا معیار یکساں اس لیے بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ خبروں، اداریوں، اشتہارات، فیچرس اور ادب وعلوم سے متعلق مضامین کی زبان کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ''انقلاب''، ''سیاست''، ''سالار''، '' قومی آواز''، ''راشٹریہ سہارا''، ''اردو ٹائمز''، ''ملاپ''، ''ندیم''، ''اردو فکشن'' وغیرہ روزناموں میں ہر ہفتہ ادبی ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے جن کے ادبی مشمولات کی زبان معیاری قرار دی جاسکتی ہے لیکن خبروں میں اس معیار کو برقرار رکھنا اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ خبروں کا تعلق عام قاری سے بھی ہوتا ہے۔

اداریے، اخبارات کی جان ہوتے ہیں اور کئی اخبارات اداریوں کے سبب جانے اور پڑھے جاتے ہیں لہذا اداریوں کی زبان میں موضوع اور اسلوب کی مناسبت اور اس کا معیاری ہونا ضروری ہے۔ روزنامہ'' قومی آواز'' کے اداریے کے اوپر ایک شعر شائع کیا جاتا ہے جو عموماً موضوع سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اخبار کو دلچسپ اور معیاری بنانے کیلیے دیگر اخبارات بھی اس کی پیروی کر سکتے ہیں۔

آج کے اردو اخبارات کی زبان کے معیار میں کمی کا ایک سبب زبان کی خامیاں، تکرار، ترجمہ اور املا کی اغلاط، جملوں کی طوالت اور بے ربطی بھی ہے۔ لکھنا ایک آرٹ ہے۔ زبان کے مناسب استعمال اور حقائق کی معروضی پیشکش کے بغیر متعلقہ موضوع یا مواد غیر دلچسپ اور بوجھل بن جاتا ہے۔ ماہرین کی رائے ہے کہ انسان وہی پڑھنا پسند کرتا ہے جو دلچسپی کا حامل ہو اور اس کے لیے تحریر کا سلیس اور مربوط ہونا لازمی ہے۔ ژولیدہ بیانی، پیچیدگی یا اسلوب کی یکسانیت اخبار کے معیار اور اس کی ہر دلعزیزی کو متاثر کرتی ہے۔ زبان کو دلچسپ اور اثر انگیز بنانے کے لیے سہل لفظیات، چھوٹے، مربوط جملے اور ٹھوس دلائل کے ساتھ قاری کی پسند کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر روڈولف فلیش کا کہنا ہے کہ:

''جب کسی جملے کی طوالت 20 لفظوں سے زیادہ ہو جاتی ہے تو
وہ دشوار اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔''

ہمارے اردو اخبارات میں بعض جملوں کی اوسطاً لمبائی 20 سے 30 لفظوں تک دیکھنے میں آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جملوں کی ساخت میں لفظوں کی تعداد پر ہمارے صحافی کم ہی توجہ دیتے ہیں۔

اخبارات کے قارئین میں ہر مکتبہ فکر، عمر، جنس اور طبقے کے افراد شامل ہیں لہذا سبھی کی پسند، فکر اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات وحادثات سے متعلق خبروں میں ایسی زبان استعمال ہونی چاہیے جس سے تحیر خیزی، مبالغہ آمیزی یا خوف وہراس کی فضا کے بجائے مثبت رویہ اور بیداری کی لہر پیدا ہو سکے۔ آج کے کئی اخبارات زرد صحافت کا شکار ہیں۔ وقتی مفادات نیز سستی شہرت حاصل کرنے میں یہ حربہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس سے اخبار کو معیار اور وقار حاصل نہیں ہوتا اور اس کی سچی خبریں بھی مشکوک قرار پاتی ہیں۔

زبان کی سلاست، روانی، اظہار کی دلنشینی اور واقعات کی سچائی، معیاری اخبار کی پہچان ہے۔ اخبارات میں ایک ایک لفظ کی اہمیت ہے اس کے ایک ایک لفظ کو ٹیلی گرام کی تکنیک کی طرح جانچنے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

عصر حاضر میں سائنسی ترقیات اور تبدیلی حالات نے صحافت کا دائرہ وسیع کردیا ہے۔ اب اخبارات کا کام محض خبر رسانی یا ادبی اور مذہبی مواد فراہم کرنا ہی نہیں قارئین کے بدلتے معیار ومزاج سے آگاہی لفظ شناسی اور علوم جدیدہ کی اصطلاح سازی اخبارات کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ زبان کی تشکیل وتوسیع کا عمل ہر آن جاری ہونے کے سبب ذخیرۂ الفاظ میں متواتر اضافہ ہورہا ہے اور اس کام کو ادیبوں کے مقابلے میں صحافی بطریقۂ احسن انجام دے رہے ہیں۔ وہ الفاظ جو ادب پاروں یا لغات میں شامل نہیں ہوتے اخبارات کے ذریعے ہی قارئین تک پہنچتے ہیں اور اخبارات سے نئی فنی

اصطلاحات مخفف اوران کی وجہ تسمیہ کا علم ہوتا ہے۔

صحیح مواد، صحیح تراجم، دلچسپ واہم خبروں کا انتخاب، مناسب زبان اخبارات کے معیار کا پیمانہ ہے اور یہ باتیں ہر اخبار کے لیے اس لیے ضروری ہیں کہ نئی نسل کی ذہنی علمی اورفکری تعمیر میں اردو اخبارات آج بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

'تیز سے تیز تر اور خوب سے خوب تر' الیکٹرانک میڈیا کی ترقی پرنٹ میڈیا کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے۔اس کے اثرات سے روزنامے متاثر ہورہے ہیں۔ سہ روزہ ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات کو مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ جن میں News سے زیادہ Views پر توجہ دی جاتی ہے اور مختلف النوع موضوعات سے متعلق تفصیلی مواد شائع کیا جاتا ہے۔ ان کی زبان نسبتاً معیاری ہوتی ہے اور پڑھنے والے بھی سنجیدہ اوراعلیٰ علمی ذوق کے حامل ہوتے ہیں۔ سہ روزہ ''دعوت'' کی زبان آج کے اردو اخبارات میں اپنا ایک خاص معیار رکھتی ہے۔اس کی دیگر مشمولات کے ساتھ اس کے مراسلات واشتہارات کی زبان بھی معیاری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بھیونڈی کے محمد ابراہیم انصاری کا مراسلہ بعنوان ''کشمیر کی خاتون رہنما کے نام'' کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''میں آپ کے اخبار کے توسط سے یہ چند سطریں کشمیر کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی رہنما محبوبہ مفتی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔
>
> محترمہ! میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ریاست کے مظلوم ومصیبت زدہ عوام کے لیے بڑے پیمانے پر سماجی خدمت انجام دیں۔ لاکھوں بچے یتیم، بزرگ بے کس اورخواتین بے سہارا ہیں، حتیٰ کہ ہزاروں کشمیری اپنا دماغی توازن کھوچکے ہیں اور وہاں مینٹل اسپتالوں میں علاج کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ ایسا آ ہنی پردہ پڑا ہوا ہے کہ صورتِ

حال کی سنگینی کا پورا اندازہ کرنا ہمارے لیے بہت دشوار ہے۔
مگر آپ بخوبی واقف ہیں۔ کاش حکومت ہند پنجاب کی
بغاوت فرو کرنے کا طریقہ کشمیر میں بھی استعمال کرتی۔ مگر
یہاں عزت نفس کو قتل کردیا گیا جس سے حالات اس قدر
دگرگوں ہوگئے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ایک تنظیم
قائم کریں اور مختلف مقامات پر اس کی شاخوں کے ذریعے بلا
امتیاز مذہب وملت خدمتِ خلق شروع کردیں۔''

آج جبکہ صحافت وادب مطالعے سے زیادہ مشاہدے کا سبب بن گئے ہیں۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ نے کتاب واخبار کی ثقافت کو متاثر کردیا ہے۔ رنگ برنگ کتابوں سے مزین کتب خانوں کی جگہ سی ڈی اور انٹرنیٹ نے لے لی ہے اور حرفِ مدعا بذریعے انٹرنیٹ ادا ہورہا ہے۔ جو مسرت اور بصیرت مطالعے سے حاصل ہوتی ہے وہ مشاہدے یا سماعت کے ذریعے کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟ یہ سوال اہلِ ادب و صحافت کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

ایسی صورت میں اردو صحافت کو ہم عصر صحافت کے معیار سے ہم آہنگ کرنے نیز اسے باوقار، بامقصد اور مفید تر بنانے کے لیے موضوعات کے تنوع کے ساتھ زبان کا معیار تبدیل کرنا ہوگا کہ اس کے بغیر معیاری اردو صحافت کا تصور محال ہے۔

شفیع ایوب

اردو صحافت کے ارتقا میں الہلال اور البلاغ کا حصہ

ہندستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوا۔ 29 جنوری 1780 کو کلکتہ سے جیمس آگٹس ہکی نے انگریزی زبان کا ہفت روزہ ''ہکیز گزٹ'' یا'' کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر'' شائع کیا، اس طرح ہندستان میں صحافت کا آغاز انگریزی زبان سے ہوا۔ کلکتہ ہی میں اردو کے پہلے ہفت روزہ ''جام جہاں نما'' سے اردو کی مطبوعہ صحافت کی ابتداء ہوئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کے بعد ایک زمانے تک ''دہلی اردو اخبار'' کو اردو کا پہلا اخبار سمجھا جاتا رہا۔ لیکن جناب گربچن چندن صاحب کی تحقیق نے یہ ثابت کردیا کہ ''جام جہاں نما'' ہی اردو کا پہلا اخبار ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ''دہلی اردو اخبار'' دہلی اور شمالی ہند کا پہلا مطبوعہ اخبار ہے۔ 1822 میں شائع ہونے والا اخبار ''جام جہاں نما'' سے لے کر ''ہمدرد'' تک اردو اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں اردو صحافت کی تاریخ بیان کرنا میرا مقصد قطعی نہیں ہے۔ لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور چاہوں گا کہ ''دہلی اردو اخبار''، ''سید الاخبار''، ''کوہ نور''، ''خیر خواہ ہند''، '' فوائد الناظرین''، '' اخبار سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، اودھ

پنچ، پیسہ اخبار، اردوئے معلی اور ہمدرد میں سے کسی ایک اخبار کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جو الہلال کے حصے میں آئی، اگرچہ ''جام جہاں نما'' سے لے کر ہمدرد تک مختلف اوقات میں مختلف اخبارات کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور یہ اخبارات حکومت وسماج پر اثر انداز بھی ہوئے۔ان تمام اخبارات کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن ''الہلال'' نے جو تحریک پیدا کی، الہلال سے جو ہنگامہ برپا ہوا، الہلال نے صحافت کا جو معیار قائم کیا اس کی دوسری کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اردو کے ابتدائی اخبارات کے بارے میں محمد شاہد حسین اپنی کتاب ''ابلاغیات'' میں رقمطراز ہیں:

> ''ابتدا میں اردو اخبارات ہفت روزہ یا سہ روزہ تھے۔ان میں الگ سے اداریہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی خبر کے ساتھ دو تین سطروں کا تبصرہ درج کردیا جاتا تھا.........اس وقت کی خبروں میں آج کی طرح سرخیاں بھی نہیں ہوتی تھیں۔''[1]

اردو اخبارات کو ایک نیا طرز اور ایک نئی فکر عطا کرنے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نہایت اہم رول رہا ہے۔ مولانا نے 1912 میں کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا۔ ''الہلال'' کے پہلے ہی شمارہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا:

> ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے سیم وزر کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔''[2]

مولانا آزاد کے ان جملوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ آنے والے دنوں

تیں "الہلال" کو کیا رول ادا کرنا تھا۔ "الہلال" اپنی اشاعتی زندگی کے تین ادوار سے گزرا۔ "الہلال" کا پہلا دور 13 جولائی 1912 سے شروع ہوکر 18 نومبر 1914 پر ختم ہوتا ہے۔ اس درمیان اس کے کل ایک سو گیارہ (111) شمارے شائع ہوئے۔ اس کا دوسرا دور "البلاغ" ہے جو 12 نومبر سے 31 مارچ 1916 کے زمانے کو محیط ہے۔ بقول مالک رام "مولانا نے 12 نومبر 1915 کو دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کردیا۔ صرف نام کا فرق تھا ورنہ دونوں کی صوری اور معنوی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا۔"[3]

"الہلال" کا تیسرا اور آخری دور 10 جون 1927 سے شروع ہوتا ہے اور 9 دسمبر 1927 پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے دور میں "البلاغ" کے نام سے کل گیارہ شمارے اور آخری دور میں پھر "الہلال" کے نام سے کل 24 شمارے شائع ہوئے۔ اس طرح 13 جولائی 1912 سے لے کر 9 دسمبر 1927 تک الہلال کے کل 146 شمارے شائع ہوئے۔

جناب عبدالرحمٰن بجنوری نے "دیوان غالب" کا مقدمہ لکھتے ہوئے لکھا تھا "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔"[4]

کچھ یہی صورتِ حال "الہلال" کے ان 146 شماروں کی بھی ہے۔ معاشیات، جغرافیہ، تاریخ اور عمرانیات سے لے کر مذہب، سوانح اور ادب کے ساتھ ساتھ سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، کون سا ایسا موضوع ہے جو الہلال کے ان 146 شماروں میں موجود نہیں۔ مولانا آزاد حکومت برطانیہ کے ہر ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ ایسے لوگ بھی "الہلال" کی تحریروں کے نشانے پر تھے جو حکومتِ برطانیہ کی بے جا حمایت کرتے تھے یا اپنے مفاد کے لیے ملک و ملت کے مفاد کو قربان کرنے پر آمادہ تھے۔

علی جواد زیدی مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ صحافی تھے مگر ادب کی سرحدوں سے باہر کبھی قدم نہیں

رکھا۔ ادیب تھے مگر اپنے ادب کو وقف صحافت کئے رہے، اور
پھر ادب وصحافت دونوں ہی کو اپنی سیاست کا تابع اور آلہ کار
بنالیا۔'' 5

مولانا آزاد کی نثر کو لے کر بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ نثر میں شعریت اور بلند آہنگی کی باتیں بہت ہوچکی ہیں۔ اگر چہ ''الہلال'' کی ادارت میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عبادی اور مولانا عبدالسلام ندوی جیسے قابل حضرات مولانا آزاد کے معاون تھے لیکن الہلال زیادہ تر مولانا آزاد کی کوششوں کا رہینِ منت تھا۔ اس کی بیشتر تحریریں مولانا ہی کی ہوتی تھیں۔ الہلال کی تحریروں میں زبردست جوش اور بلند آہنگی موجود ہے۔ دراصل الہلال کا یہ انداز تخاطب اس بحرانی دور کی پیداوار تھا جس سے اس وقت ہندستان گزر رہا تھا اور جو اس وقت عالم اسلام کی صورت حال تھی۔ مسلم سیاست افراتفری اور پراگندگی کا شکار تھی۔ برطانوی سامراج ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج کو وسیع سے وسیع تر کردینا چاہتا تھا۔ یورپ کی طاقتیں اپنی ریشہ دوانیوں سے اسلامی ممالک کو مضمحل اور بے جان کررہی تھیں۔ ایسے بحرانی دور میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے ذریعے جس بلند آہنگی سے کام لیا وہ وقت کی ضرورت تھی۔ ورنہ ''ترجمان القرآن'' کی نثر سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا صاف، سلیس، باوقار مگر آہستہ روی کے انداز کی نثر پر بھی بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ گویا اردو صحافت کے سفر میں نثر کا معیار بھی ''الہلال'' نے ہی قائم کیا۔

''الہلال'' کے افسانے اور حصۂ شعری بھی دیگر اخبارات کے لیے مشعل راہ بنے۔ الہلال کے مضمون نگاروں میں ملک کے صفِ اول کے ادیب اور انشا پرداز شامل تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکے کی نظمیں جیسے ''عدل جہانگیری'' پہلی مرتبہ الہلال ہی میں شائع ہوئیں۔

چونکہ مولانا آزاد خود علم کا سمندر تھے۔ پختہ سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ مختلف

موضوعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔سیاسی خبریں تو ''الہلال'' کے علاوہ ''زمیندار'' لاہوراور ''ہمدرد'' دہلی میں بھی شائع ہورہی تھیں لیکن مولانا نے ''الہلال'' کومعلومات کا خزانہ بھی بنادیا تھا۔ اکثر لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ 1913 میں مولانا جدید انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ ''الہلال'' میں شائع کررہے تھے۔ الہلال کے 17 دسمبر 1913 کے شمارے میں صفحہ نمبر 10 پر Caligraphy, Cardiology اور Hydrodynamics جیسے انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔ تقریباً نوے سال بعد ہم آج یہ محسوس کررہے ہیں کہ تمام انگریزی اصطلاحات کا مناسب اردو متبادل ہونا چاہیے۔لیکن الہلال کے ذریعے 1913 میں یہ کام شروع ہوچکا تھا۔ اسی کے ساتھ نئی کتابوں ، رسالوں اور اخبارات پر تبصرے بھی اس میں ہوتے تھے۔ چونکہ ''الہلال'' ایک مشن کے طور پر نکل رہا تھا اس لیے دوسرے اردو اخبارات کے تئیں اس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر نے کوچہ چیلان دہلی سے ''ہمدرد'' جاری کیا تھا۔ ''ہمدرد'' کی اشاعت پر ''الہلال'' نے بار بار خوشی کا اظہار کیا۔دراصل آنے والے دنوں میں اردو اخبارات کے لیے یہ ایک اخلاقی درس تھا۔

''الہلال'' سے پہلے اردو اخبارات عام طور پر دو ذرائع سے خبریں حاصل کرتے تھے۔ایک تو انگریزی اخبارات سے دوسرے ہندستان کی مختلف ریاستوں سے شائع ہونے والے قلمی اخبارات سے لیکن مولانا آزاد نے خبروں کے حصول کے لیے جدید طریقہ کار کو اپنایا۔ ملک اور بیرون ملک نامہ نگاروں کی خدمات لی گئیں۔ مولانا امداد صابری اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

> '' الہلال ہندستان کی آزادی کا نقیب تھا۔ اس کے تمام بیرونی نامہ نگاروں رپورٹوں سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح مختلف ملکوں سے آئی ہوئی رپورٹوں کو ایک لڑی میں پروکر پیش کیا جاتا تھا۔''[6]

دراصل مولانا آزاد کی ذات کی طرح ''الہلال'' بھی قدیم وجدید کا

خوبصورت سنگم تھا۔ اس میں فلسفہ اور منطق بھی تھا۔ ادب، سیاست اور ہم عصر مسائل پر گفتگو بھی ہوتی تھی۔ الہلال صحیح معنوں میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا علم بردار تھا اس نے ہندستان کے مجاہدین آزادی کے ذہنی افق کو وسعت بخشی۔ یہ سچ ہے کہ مولانا آزاد لیلائے سیاست کی زلفوں کو سنوارنے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ دسمبر 1927 میں ''الہلال'' کو بند کرنا پڑا۔ لیکن اس وقت تک ''الہلال'' کی آتش نوائیوں نے ملک بھر میں ایک آگ لگادی تھی۔ ''الہلال'' کے ذریعے جو نغمہ لاکھوں دلوں تک پہنچ چکا تھا وہ نغمہ اور اس نغمہ کا آتشیں آہنگ اردو صحافت نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔

''الہلال'' بھی دوسرے اخبارات کی طرح مالی دشواریوں سے گزرتا رہا۔ لیکن شانِ استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب الہلال کے لیے ایک ہندستانی والی ریاست نے ایک گراں قدر رقم کا چیک بھیجا اور یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہ رقم ہر ماہ بھیجتے رہیں گے تو مولانا نے یہ پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ ''الہلال'' کا قلم کسی قیمت پر بھی بک نہیں سکتا۔ اردو صحافت کے لیے الہلال کا یہ کھلا پیغام تھا کہ اردو کے کسی صحافی کو یہ نہ کہنا پڑے کہ 'یہ زباں کسی نے خرید لی یہ قلم کسی کا غلام ہے۔''

بقول مولانا محمد علی جوہر کہ ''الہلال'' کے ذریعے مولانا آزاد نے اردو صحافت میں ایک نئی روایت قائم کی۔'' دراصل یہ روایت صوری بھی تھی اور معنوی بھی۔ اس سے پہلے اخبار عام طور سے لیتھو پریس میں اور نستعلیق خط میں چھپتے تھے۔ لیتھو کی وجہ سے تصاویر کی طباعت ممکن نہیں تھی۔ چھپائی اکثر خراب ہوتی اور کتابت کی بہت سی غلطیاں باقی رہ جاتیں۔ اس لیے مولانا آزاد نے روزِ اول سے ''الہلال'' کو عام ڈگر سے ہٹالیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

> ''اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی۔ صورت، سیرت، منظر وقالب سب میں اپنے پیشرو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار، جاندار چھپائی، کاغذ

> تصویریں سب کا معیار اعلی اور رنگین سرورق، نہ جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات، نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے، اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتے اس ادبی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے۔ اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی وشبلی کی سلاست سر پٹکتی اور اکبر الہ آبادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔''[7]

شاید اسی لیے ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب Discovery of India میں لکھا ہے:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔''[8]

الہلال جس قدر مقبول ہوتا گیا ایوان حکومت اتنا ہی متزلزل ہوتا گیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر الہلال پریس سے ضمانت طلب کرلی گئی جو پانچ دن کے اندر جمع بھی کردی گئی۔ اگلے سال 14-21 اکتوبر 1914 کا مشترکہ شمارہ حکومت بنگال نے ضبط کرلیا۔ اس کے ایک مہینے بعد پچھلی ضمانت بھی ضبط کرلی گئی اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت طلب کی گئی۔ لیکن حکومت کی تمام کارروائیوں کے باوجود ''الہلال'' کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

الہلال سیاست پر گہری نظر رکھنے کے باوجود ایک علمی اور ادبی جریدہ بھی تھا۔ اس میں جنگ بلقان، انقلاب طرابلس کے پہلو بہ پہلو غالب، عمر خیام اور فاطمہ بنت عبداللہ پر بھی اظہار خیال ہوتا تھا۔

جناب علی جواد زیدی ایک ایسے شاعر، ادیب اور دانشور ہیں جن کا شمار آزاد شناسوں میں ہوتا ہے۔ زیدی صاحب نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی فرمائش پر

1944 میں مولانا آزاد پر ایک قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ نما نظم 1944 میں ''سوغات'' میں شائع ہوئی۔ یہ واحد نظم ہے جس میں زیدی صاحب نے اپنا تخلص جواد نظم کیا ہے۔ اس قصیدہ نما نظم میں زیدی صاحب نے ''الہلال'' کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ اقبال کے مصرعے ''خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا'' کی طرف بھی دھیان جاتا ہے اور ''الہلال'' کی خصوصیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

گزرے بلاؤں میں سہ وسال ابوالکلام
قربانیاں ہیں اصل جمالِ ابوالکلام
غیروں کے سر پہ برق وطن کے لیے سپر
اللہ رے شانِ تیغِ ''ہلال'' ابوالکلام 9

آج کا زمانہ تو اشتہارات کا زمانہ ہے۔ آج صابن، تیل سے لے کر کولڈ ڈرنکس کے اشتہار میں بڑے بڑے فلمی اداکار اور کرکٹ کھلاڑی نظر آتے ہیں۔ آج مصنوعات پہ برا وقت پڑتا ہے تو کوئی فلمی اداکار یا کرکٹ کا بڑا کھلاڑی اس کے حق میں بیان دیتا ہے۔ چونکہ یہ اداکار یا کھلاڑی عوام میں بے حد مقبول ہوتے ہیں اس لیے جن مصنوعات کے بارے میں یا ان کے حق میں یہ بیان دیتے ہیں عوام میں اس کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ ''الہلال'' کے صفحات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کی حیثیت کتنی اہم تھی۔ 14-1913 میں ''الہلال'' میں اشتہار دینا کسی بھی تاجر کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتا تھا، کیونکہ ''الہلال'' کی اشاعت ایک زمانے میں 26 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت ''الہلال'' ہر ہفتے کم از کم پچاس ہزار لوگوں کی نظروں سے گذرتا تھا۔ ''الہلال'' میں جو اشتہارات شائع ہوتے تھے ان میں بعض اشیاء کے لیے اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیتوں نے بیانات دیے ہیں۔ اس زمانے کا مشہور تیل THE TAJ HAIR OIL کا اشتہار ''الہلال'' کے 21 جنوری 1914 کے

شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس تیل کے حق میں علامہ اقبال کا ذکر اس طرح ہے۔
''جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبال ایم اے بیرسٹر لاہور۔ علامہ اقبال کے اس تعارف کے بعد وہ کلمات ہیں جو علامہ اقبال نے اس تیل کے بارے میں فرمایا ہے۔ ان کا جملہ ہے ''میں یہ لکھ سکتا ہوں کہ تاج کے استعمال سے دماغ کو آرام اور قلب کو راحت ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خوش رنگ اور مصفا تیل ہندستان کے دل ودماغ پر حکومت کرے گا۔''

اکبرالہ آبادی نے اسی تیل کے لیے لکھا تھا ؎

دماغ کے لیے خوشبو کا کھیل اچھا ہے
ہوا بھی مست ہوئی ہے کہ تیل اچھا ہے

یہ امر تحقیق طلب ہے کہ علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی جیسے حضرات اشتہارات کے لیے رقم لیتے تھے یا نہیں؟

محض ان دو مثالوں سے واضح ہے کہ شعبہ اشتہارات میں بھی ''الہلال'' اپنے زمانے کے تمام اخبارات سے بہت آگے تھا۔ اور آج اردو اخبارات کا قافلہ جس مقام پر پہونچا ہے وہاں اشتہارات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن اشتہارات کے معاملے میں بھی ''الہلال'' نے اگلے زمانے کے راستوں کا تعین کر دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ''الہلال'' سے پہلے اس شان کا کوئی ہفتہ وار پرچہ اردو میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ''الہلال'' کے بعد بھی جو پرچے نکلے ان کے سامنے نمونہ ''الہلال'' ہی کا رہا۔ ہر کسی کی یہی خواہش رہی کہ شکل وصورت، مضامین کی ترتیب، اداریے اور تصاویر وغیرہ میں ''الہلال'' کا تتبع کریں۔ دراصل ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے بہت سی روایتیں قائم کیں جن کا بعد کے اخباروں نے اتباع کیا۔ اپنے علمی، ادبی اور سیاسی نقطۂ نظر کی بنا پر ''الہلال'' اور البلاغ'' نے اردو صحافت کے ارتقاء میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ کیونکہ تمام صعوبتوں، تمام پابندیوں کے باوجود ''الہلال'' کا رویہ یہ رہا کہ

نہ جانے کتنے دل بن جائیں گے اک دل کے ٹکڑے سے
وہ توڑیں آئینہ ہم آئینہ خانہ بنادیں گے

حوالہ

1۔ ابلاغیات، ص 78

2۔ الہلال، 13 جولائی 1912، ص 2

3۔ مالک رام، کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1989، ص 60

4۔ دیوان غالب، نسخہ حمیدیہ، ص 39

5۔ علی جواد زیدی، کمال ابوالکلام، ص 15

6۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، دہلی 1953، ص 167

7۔ علی جواد زیدی، کمال ابوالکلام، ص 107

8. Discovery of India, p. 167

9۔ علی جواد زیدی، کمال ابوالکلام، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1989، ص 13

کمال احمد صدیقی

ریڈیائی تحریر کی خصوصیات

ریڈیو کے لیے جو تحریر ہوتی ہے، اس کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بولے ہوئے لفظوں، فقروں اور جملوں کی تحریری صورت ہوتی ہے۔ تقویم میں جو سب سے احسن ہے، اس سے انسان خلق ہوا۔ حیوان اور انسان میں امتیاز نطق کی وجہ سے ہے۔ نطق اور بیان ذہنی عمل سے جڑے ہوئے ہیں، جس کی سب سے اہم جہت تفہیم اور استدلال ہیں۔ یہ کوئی ہموار راستہ نہیں ہے، کیونکہ تفہیم اور استدلال ہی سے ایک راستہ عیاری کا بھی پھوٹتا ہے۔

صحیفے سب بولے ہوئے لفظوں پر مشتمل تھے۔ تحریر بعد میں کیے گئے۔ چنانچہ صحیفوں کی عبارتیں بے تکلف ہیں۔ ان میں قدرتی روانی ہے اور مفہوم براہِ راست بیان ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دو یا زیادہ سامع مختلف مفاہیم اخذ کریں۔ یہ بولے ہوئے لفظ کی خصوصیت ہے، اور یہی اچھی ریڈیائی پروگرام کی تحریر کی کسوٹی بھی ہے۔

یہ چند باتیں ابتدا میں اس لیے عرض کیں کہ ریڈیو کے لیے جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس کے سلسلے میں بنیادی بات سے آغاز ہو۔

یہ یقیناً بنیادی بات تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم، اور اس سے بھی زیادہ بنیادی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ اہم براڈ کاسٹر نہیں، براڈ کاسٹ کا مسودہ لکھنے والا نہیں، بلکہ وہ سامع ہے، جس کے لیے پروگرام براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے، یا براڈ کاسٹ کیا جارہا ہے۔

مختلف پروگراموں کے سامعین مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا احساس آل انڈیا ریڈیو کوشروع ہی سے تھا۔ چنانچہ کچھ پروگرام، جیسے کسانوں کے لیے پروگرام، بچوں کے لیے پروگرام، فوجیوں کے لیے پروگرام، خواتین کے لیے پروگرام پہلے Minority Programmes کہلاتے تھے۔ بعد میں انھیں Special Audience پروگرام کہا جانے لگا۔ موسیقی کے پروگرام، ڈرامے وغیرہ Formah الگ نہیں تھے، بلکہ ان کے سامعین بھی الگ تھے، اور ہیں لیکن اور پروگرام بھی رہے ہیں، جن کے سامعین کا تعین آسان نہیں۔ خاص طور سے ان پروگراموں کا جو ایک مہم کے تحت وضع کیے جاتے ہیں۔ ان میں بات چیت جسے Talks کہا جاتا ہے، یا فیچر، یا دستاویزی فیچر۔

جن سامعین کے لیے یعنی جس TARGET AUDIENCE کے لیے مہم چلائی جانا ہے، اس کی زندگی، اس کی مشکلوں، اس کی تمناؤں اور اس کے خوابوں سے اگر پروگرام مرتب کرنے والے، اور پروگرام لکھنے والے واقف نہیں تو کسی کامیابی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ سامعین دلچسپی اور توجہ سے پروگرام اسی وقت سنیں گے، جب وہ پائیں گے کہ پروگرام کا ان کی زندگی سے تعلق ہے اور یہ کہ اس پروگرام کی باتوں پر اگر وہ عمل کریں گے تو اس سے ان کی زندگی سدھرے گی۔ پروگرام سننے کے بعد بہت سے پروگرام کی مفید باتوں، اور کمزور پہلوؤں کے بارے میں لکھیں گے۔ ہر اسٹیشن میں Audience Research کا ایک شعبہ ہوتا ہے، اور وہ سامعین کے ردعمل کی اطلاع متعلقہ پروگرام کے شعبے کو دیتا ہے۔ اس پر کس حد تک عمل ہوتا ہے، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اصول یہ ہے کہ پچھلے پروگرام میں جو کمیاں ہیں، وہ اس سلسلے کے اگلے پروگرام

میں دور کی جائیں۔ ایک پروگرام لکھ کر یا براڈ کاسٹ کر کے سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اگلے پروگرام کی ترتیب اور تحریر کے وقت سامعین کے ردعمل کو سامنے لکھا جائے، اور اس پر عمل کیا جائے۔

گفتگو ریڈیائی پروگرام کی تحریر کی خصوصیات کی ہو رہی ہے۔ زبان، وہ بول چال میں ہو یا تحریری عبارت کی۔ زبان اور زبان میں فرق ہوتا ہے۔ ادب کا طبقاتی کردار ہوتا ہے، لیکن زبان کا طبقاتی کردار نہیں ہوتا۔ پھر بھی زبان، اور الفاظ کے برتنے کے طریقے میں فرق ہوتا ہے۔ غالب کے بعض خطوں کی زبان ویسی نہیں، جیسی ان کے ان خطوں کی ہے، جن میں وہ مکتوب الیہ سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ایک طرف سرسید اور حالی کی نثر ہے (آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کی عبارت آرائی کو چھوڑ کر، جو ان کی نہیں ہے) اور دوسری طرف شبلی کی پر تکلف نثر ہے، جو ترجمان القرآن اور غبار خاطر میں ابوالکلام آزاد کے یہاں ہے (چڑے کی کہانی کو چھوڑ کر)۔

ریڈیو کے لیے بول چال کی زبان — بول چال کی اردو ہی براڈ کاسٹ کی زبان ہے۔ ریڈیو کی کہانی کے لیے منشی پریم چند کی نثر اور گفتگو کے لیے مولوی عبدالحق کی نثر اعلیٰ ترین معیاری زبان ہے — لیکن ان کے اپنے عہد کی۔ زبان وقت کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے سے بدلتی ہے، بتدریج، اور جب بدل جاتی ہے، زبانوں پر لفظ چڑھ جاتا ہے، تو ٹکسالی ہو جاتا ہے۔ باغات کی جگہ باغان اب اجنبی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

ریڈیو کے پروگراموں کی زبان میں ایک فیکٹر ترجمے کا ہے۔ لمبے لمبے پیچیدہ جملے انگریزی کاپی میں دے دیے جاتے ہیں، اور بہت ہی محدود وقت میں اس کو ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ پروگراموں اور خبروں کی زبان کا تجزیہ میں نے تحقیقی مقالے کے دو طویل ابواب میں کیا ہے۔ مثالیں نقل کرنے کے بجائے صرف حوالے پر اکتفا کرتا ہوں، تاکہ گفتگو طویل نہ ہو۔

ریڈیو کے لیے لکھنے، اور پڑھنے کے لیے لکھنے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ

براڈ کاسٹر اور سامعین کے درمیان صرف سماعت ہے۔ لکھی ہوئی تحریر، دوبارہ پڑھی جا سکتی ہے، سمجھ میں نہ آئے، تو کئی بار ایک فقرہ، یا جملہ یا پورا پیراگراف پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن ریڈیو میں ایسا نہیں ہے۔ ہر لفظ اہم ہے۔ ایک لفظ بھی سر سے گذر گیا— تو ساری بات سر سے گذر گئی۔ اسلوب بول چال کا ہوگا، اور اگر کوئی مشکل نکتہ ہے، تو گفتگو کے انداز میں بات اس طرح دہرائی جاتی ہے کہ سامع کو قدرتی گفتگو معلوم ہو۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا... یا اس بات سے آپ کو اتفاق ہوگا...اور بھی طریقے ہیں۔

براڈ کاسٹ کی کامیابی کی کسوٹی یہ ہے کہ جو بات کہی گئی، جو نکتہ پیش کیا گیا، وہ سامع کے ذہن میں محفوظ رہے۔ اسے Recall کہتے ہیں۔ اگر مکمل Recall نہیں ہے، یا تقریباً مکمل Recall نہیں ہے، تو براڈ کاسٹ پوری طرح ناکام ہے۔

Recall یقینی بنانے کے لیے بھی طریقے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ آپ نے جو بات کی، اس میں کچھ کہانی پن ہو ANECDOTAL VALUE پیدا کیجیے۔ ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ یا لطیفہ یاد آئے گا تو ساری بات یاد آئے گی۔ کبھی کبھی ایک مناسب شعر، کسی گانے کی دھن یا ایسی ہی کوئی ترکیب مصنف استعمال کرتا ہے۔

ہمارے صحیفوں میں جو واقعات، قصے ہیں، وہ اب بھی خیال کی ترسیل اور ابلاغ کی صلاحیت رکھتے ہیں— اور اس پر میں یہ گفتگو ختم کرتا ہوں۔

رفعت سروش

ریڈیو ڈرامہ نگاری کا فن

1930 میں فلم کی آمد سے پارسی تھیٹر کو دھچکا سا لگا اور منظرنامہ بدلنا شروع ہوا۔ 28 /اپریل 1935 کو آغا حشر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے مگر ایک ایسی جگہ بنا کر کہ اردو ڈرامے کے ساتھ ان کا نام اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اردو زبان باقی ہے۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ 1935 میں آغا حشر کا انتقال ہوا اور 1936 میں آل انڈیا ریڈیو وجود میں آیا اور ڈرامے نے ایک نیا اور اہم موڑ لیا۔

ریڈیائی ڈرامے کے ذکر سے پہلے امانت اور آغا حشر کی روایت کے ذکر کے علاوہ ایک اور اہم نام یاد آتا ہے۔ ایسا نام جس کو سلام کیے بغیر ہم ریڈیو ڈرامے کے ایوان میں داخل نہیں ہوسکتے اور وہ نام ہے۔ ''امتیاز علی تاج۔ امتیاز علی تاج کا ڈرامہ 'انارکلی' اردو ڈرامے کا ایک نیا سنگ میل ہے۔ پارسی تھیٹر اور آغا حشر کا ڈرامہ نظم اور نثر کا لذیذ دسترخوان ہے اور بلند آہنگ مکالموں کا ہوا محل۔ ایک ایسا اسٹائل جو آغا حشر کے ساتھ ہی ختم ہوگیا اور شاید وقت کی ضرورت بھی یہی تھی۔ اب ڈرامے کو درکار تھا قدرتی ماحول، قدرتی اندازِ تحریر اور ایسے مکالمے جو عام زندگی سے مطابقت کریں اور یہ کام امیاز

علی تاج نے کیا۔ اردو ڈرامہ فضا میں معلق تھا، تاج اسے زمین پر اتار لائے اور اس کے پھلنے پھولنے کے لیے قدرتی ماحول مہیا کیا۔ امتیاز علی تاج جدید تعلیم سے آراستہ تھے، ادب کے نئے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ فن کی باریکیوں اور نزاکتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے مغل شہنشاہ کے دور سے منسوب محبت کے افسانے کو پیش کیا جس کے بنیادی کردار تھے، شہزادہ سلیم۔ خود اکبر اعظم اور ایک شاہی کنیز ''انارکلی'' یہ ڈرامہ نہایت سادہ اور سلیس اردو میں لکھا گیا اور کرداروں کے منہ سے وہی زبان ادا کرائی گئی جو وہ عام زندگی میں بولتے ہیں لیکن آغا حشر کے اسٹائل کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ امتیاز علی تاج نے ''انارکلی'' 1922 میں مکمل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے تاج نے کوشش کی ہوگی کہ ان کا ڈرامہ اسٹیج کیا جائے، مگر کسی تجارتی ڈرامہ کمپنی نے اس ڈرامے کو اپنے تھیٹر کے قابل نہ سمجھا 1932 میں اس ڈرامہ کو دارالاشاعت (پنجاب) نے شائع کیا تب یہ شاہکار اہل نظر کے سامنے آیا اور اس ڈرامے نے اپنے خالق کو وہ شہرت بخشی کہ آج وہ ڈرامہ کی تاریخ میں ایک بہت بلند مقام پر فائز ہیں اور آگے چل کر 'انارکلی' کے ڈانڈے ریڈیائی ڈرامے سے مل جاتے ہیں۔

سید ذوالفقار علی بخاری کو ریڈیائی ڈرامے کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہیں۔ 1925 میں بخاری صاحب اپنے وطن پشاور سے بہ سلسلۂ ملازمت شملہ میں آبسے تھے۔ فوجی ملازمت تھی اور ان کا عہدہ تھا MEMBER BOARD OF EXAMINATIONS وہ انگریز افسروں کو اردو فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ ڈرامے سے انھیں فطری دلچسپی تھی اور انھوں نے شملہ میں تھیٹر کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اپنی 'سرگذشت' میں 'انارکلی' کی پیشکش کا حال لکھا ہے۔ جس سے ان کے کردار اور ان کی ریڈیو سے نسبت پر روشنی پڑتی ہے:

> ''1935 کا ذکر ہے کہ میں نے سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ 'انارکلی' گیٹی تھیٹر شملے میں پیش کیا۔ سلیم کا پارٹ میں خود کر رہا تھا اور میں ہی اس ڈرامے کا پروڈیوسر بھی تھا۔ تھیٹر کی

اگلی تین صفیں میرے انگریز دوستوں سے بھری ہوئی تھیں،
اس ڈرامے کی اور میرے پارٹ کی بہت تعریف ہوئی۔ اگلے
روز جب میں اپنے دوست سے ملنے گیا تو اس نے بجائے
سبق پڑھنے کے 'انارکلی' ڈرامے کا ذکر کرنا شروع کر دیا اور کہا
تم باقاعدہ تھیٹر چلانے کا پیشہ کیوں اختیار نہیں کر لیتے۔
میں نے کہا۔ بھائی یہ فلم کا زمانہ ہے، تھیٹر کو کون پوچھتا ہے۔
اس نے کہا — تو پھر فلم سازی شروع کردو۔ میں نے
کہا۔ ناصاحب! فلم کے حسنِ جہاں تاب سے آنکھیں خیرہ
ہونے کا ڈر ہے۔ بہت ہنسے اور فرمایا تو پھر براڈ کاسٹنگ کے
بارے میں کیا خیال ہے، میں نے براڈ کاسٹنگ کا کبھی نام بھی
نہیں سنا تھا۔ میں نے کہا — صاحب براڈ کاسٹنگ کیا بلا
ہے۔ اس پر انھوں نے مارکونی اور جانے کس کس کا ذکر کر کے
مجھے بتایا کہ براڈ کاسٹنگ کیا ہے، پھر کہا کہ پرسوں شب لارڈ
ولنگڈن کی ضیافت میں ایک صاحب فیلڈن نامی سے ملاقات
ہوئی تھی۔ وہ یہاں لندن سے براڈ کاسٹنگ کی بنیاد رکھنے
آئے ہیں۔ ان کو ایسے آدمیوں کی سخت ضرورت ہے جو براڈ
کاسٹنگ کی صلاحیت رکھتے ہوں۔"[1]

سید ذوالفقار علی بخاری نے فیلڈن کے اصرار پر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ کس طرح لڑتے بھڑتے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا اور کس طرح ریڈیو کی مقبولیت وتوسیع میں حکومت وقت کا ہاتھ بٹایا۔ یہ طویل داستان ہے۔ بخاری صاحب نے آل انڈیا ریڈیو میں براڈ کاسٹنگ شروع ہونے سے پہلے قدم رکھا۔ اس وقت 18، علی پور روڈ دہلی پر دفتر واسٹوڈیو تھے۔ یکم جنوری 1936 کو دہلی ریڈیو شروع ہوا، آغا حشر 1935 میں انتقال فرما چکے تھے مگر ریڈیو کی اپنی ضرورتیں ہیں۔ یہ نیا میڈیا تھا اور قدم

قدم پر لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا کہ ریڈیو کیا ہے۔ اس ضمن میں بخاری صاحب کی کتاب ''سرگذشت' مطبوعہ 1966 معارف لمیٹڈ کراچی) کے چند اقتباسات قابل غور بھی ہیں اور ریڈیو ڈراما کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد بھی دیتے ہیں۔ اس سے پہلے ایک بات اور عرض کردوں کہ 1936 میں ریڈیو کی ابتدا ہوئی۔ 1937 میں بخاری صاحب کو ٹریننگ کے لیے بی بی سی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے دہلی آئے تو اس نابغۂ روزگار کی جدت پسندی نے اس کے بہت سے مخالف کھڑے کردیے، اب سنیے ان کی زبانی:

'' دلی میں لوگ میرے دشمن کیوں ہوئے اس میں کچھ قصور میرا تھا، کچھ لوگوں کا اور کچھ تقدیر کا۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں سر پھرا تھا، ہر معاملے میں اپنی منوانا چاہتا تھا— میں نے کہا۔ اردو میں تین گھنٹے کے ڈرامے غلط بات ہے ریڈیو پر اتنے لمبے ڈرامے نہیں ہونے چاہئیں، اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر ڈرامے میں گانوں کی بھرمار ہو۔ اسٹیج پر تو یہ گانوں کی بھرمار چل جاتی ہے لیکن ریڈیو پر نہیں۔ ریڈیو کے ڈرامے آدھ آدھ گھنٹے کے یاپون پون گھنٹے کے ہونے چاہئیں، اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔

جب یہ مختصر ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے تو ایک طوفان آ گیا۔ اخبارات نے یک زبان ہوکر کہا کہ ڈرامہ بغیر موسیقی کے ہو ہی نہیں سکتا، اور پھر یہ بھی کہا کہ وہ ڈرامہ ہی کیا جو ڈھائی تین گھنٹے کا نہ ہو۔ مگر ہم اپنی بات پر اڑے ہوئے اب یہ کیا بتاؤں کہ وہ ہٹ دھرمی تھی یا وفاداری بشرطِ استواری، بہر حال ہم اپنی منوا کر رہے۔ اس ہٹ دھرمی کا نتیجہ کہیے یا کچھ اور کہ آج ریڈیو کا ڈرامہ مختصر ہوتا ہے اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔''[2]

ڈراموں کے تعلق سے بخاری صاحب نے چند لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے بالکل ابتدائی دنوں میں ریڈیو کے لیے لکھا اور ان لوگوں میں سے اکثر ریڈیو کے ملازم تھے۔

> ''ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور گوہر شادانی ہمارے ڈراموں کی جان تھے۔''[3]

> ''ریڈیو کے ڈراموں کی زبان کو آسان بنانے کے لیے کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کا تعاون حاصل کرنا آسان تھا۔ مگر غزلوں کی زبان کو کیا کرتے۔''[4]

بخاری صاحب جب دہلی سے بمبئی پہنچے تو وہاں بھی اردو ڈرامے کے فروغ کے لیے بہت کام کیا اور نوجوان کلاکاروں کی ہمت افزائی کی۔ راقم الحروف بھی ان میں سے ایک تھا:

> ''حبیب تنویر اور رفعت سروش نے بچوں کے پروگرام میں بہت کام کیا۔ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ حبیب اور رفعت سروش کی تحریوں میں بڑی کڑی نظر رکھتا تھا۔ خود مجھے کچھ لکھنا آئے یا نہ آئے لیکن دوسروں کی غلطی فوراً نظر آجاتی ہے۔ یہ دونوں جوہر قابل رکھتے تھے انھوں نے وہ مشق بہم پہنچائی کہ باید وشاید۔''[5]

ریڈیائی ڈرامہ اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے سے بالکل مختلف فنی اعتبار سے دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ ریڈیو آواز کی دنیا ہے — آواز — صرف — انسانوں کی آواز — سازوں کی آواز — موسم کی آواز — خوفناک درندوں کی آواز — دلکش پرندوں کی آواز — پانی کی آواز — ہوا کی آواز — بجلی کی آواز — بھیڑ بھڑ کے کی آواز — خاموشی اور سناٹے کی آواز — آواز — صرف آواز آوازوں

کے اتار چڑھاؤ، بہاؤ اور پیچ وخم سے ہی ریڈیائی ڈرامہ مرتب کیا جاتا ہے۔ آوازوں کو ''ایکو'' کیا جاسکتا ہے اور آوازوں کے اس کھیل کے لیے سب سے ضروری چیز ہے مائیکروفون،— اور ایسا اسٹوڈیو جو آوازوں کو جذب کرسکے، آوازوں کو ضرورت کے مطابق اچھال سکے، آوازوں کا جادو جگا سکے، مائیکروفون اور اس کے مختلف زاویے ریڈیو ڈرامہ آرٹسٹ کے لیے روحانی دوست کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہلکی سی سرگوشی بھی اگر فن کے دائرے میں ہے تو قیامت برپا کرسکتی ہے، آرٹسٹ کا ایک ایک سانس اس کے فن کا اظہار ہے۔

اسٹیج کی دنیا میں کلاکاروں کے وجود اور مکالموں کے علاوہ اسٹیج کی سجاوٹ، اس پر ضروری سامان، مناسب روشنی اور پھر کلاکاروں کی حرکات وسکنات نشست و برخاست، ان کے چہرے، میک اپ، لباس۔ اور سب سے بڑھ کر ڈرامہ کے تماش بین ضروری ہیں— مگر ریڈیائی ڈرامے میں ان سب چیزوں کا بدل ہے آواز— آواز کا تاثر اور مکالموں کی ادائیگی اور پس منظر سے ماحول کو بامعنی بنانے کے لیے موسیقی— ماہرانہ زیروبم کے ساتھ — اور صوتی اثرات جو اس خوبصورتی سے ہم آہنگ کیے جائیں کہ سننے والے پر وہی کیفیت گذرے جو ڈرامہ دیکھ کر گزرتی ہے— وہ چاہے تو آنکھ بند کرکے محو تماشا ہو جائے— اسٹیج پر جس ضرورت کے تحت مخصوص لباس زیب تن کیا جاتا ہے، میک اپ کیا جاتا ہے جو ان کو میک اپ کے ذریعہ بوڑھا بنادیا جاتا ہے۔ اس ضرورت کو ریڈیو آرٹسٹ صرف اپنی آواز سے پورا کرتا ہے، اپنے لہجے کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کردار کی پوری عکاسی کرسکے۔ ضرورت کے مطابق اسے آواز بدلنے اور کردار کو ہو بہو صرف آواز کے ذریعے پیش کرنے پر قادر ہونا چاہیے۔ ڈرامہ پروڈیوسر حسب ضرورت پس منظر میں موسیقی کا جادو جگاتا ہے اور بھیڑ بھاڑ، مثلاً بازار، ریلوے اسٹیشن یا کھیل کے میدان کا مخصوص شور ان مخصوص آوازوں کی ریکارڈنگ کے سہارے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے سب کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، چنگھاڑتے جانور، چہچہاتے پرند— دریاؤں کی طغیانی، تلواروں کا ٹکراؤ اور توپوں کی آوازیں، بموں کے دھماکے خیز

جنت۔ سب کچھ ریکارڈ کی ہوئی آواز کے ذریعہ پیش کرنا ممکن ہے جب کہ بعض مقامات پر اسٹیج اپنے آپ کو محدود پاتا ہے اور بہت سے معانی کی ترسیل نہیں کرسکتا — مثلاً آسمانوں کی سیر کرانی ہے یا سمندری طوفان میں کسی بے بس انسان کو موت سے لڑتے ہوئے دکھانا مقصود ہے، جدید اور مہلک آلات حرب کے ساتھ جنگ وجدل کا منظر پیش کرنا ہے تو اسٹیج کے بس کا روگ نہیں۔ مگر ریڈیائی ڈرامے کی پروڈکشن میں یہ سب کچھ ممکن ہے اور ایک اچھا ریڈیو ڈرامہ پروڈیوسر یہ سب کچھ آسانی سے کرسکتا ہے — ریڈیو ڈرامہ پروڈکشن اپنی جگہ ایک فن ہے اور اس فن کی شُد بُد کے بغیر اچھا ڈرامہ نہیں لکھا جاسکتا۔ ریڈیائی ڈرامے کے مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم سے کم مائیکروفون کی اہمیت وصلاحیت سے واقف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ مائک سے دوری یا نزدیکی کیا معنی رکھتی ہے — ایک ہی اسٹوڈیو — یعنی ایک ہی کمرے میں موجودگی کے باوجود محض مائک کے فاصلوں اور زاویوں کے ذریعہ آمد ورفت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ دور دور رہتے ہوئے بھی دو محبت کرنے والے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہوئے محسوس کیے جاسکتے ہیں اور ہم آغوشی کی کیفیت پیش کی جاسکتی ہے — غرض ریڈیائی ڈرامے کی دنیا بہت ہی پر اسرار اور معنی خیز ہوتی ہے۔

ڈرامے کے لیے بنیادی چیز ہے اس کا مسودہ، اسکرپٹ۔ ریڈیائی ڈرامے کے مصنف کو ریڈیائی سے واقفیت ضروری ہے ورنہ ممکن ہے ڈرامہ محض پڑھنے والا مصالحہ ہوکر رہ جائے، پیشکش کی چیز نہ بن سکے۔ مکالمے بھی کرداروں کے ماحول کے لحاظ سے اس کی ہی زبان میں ہونے چاہئیں۔ مصنف کی اپنی زبان میں نہیں۔ ڈرامہ نگاران تمام امکانات کو بروئے کار لاتا ہے، جو ریڈیو تکنیک اسے مہیا کرسکتی ہے۔ اور وہ اپنے اسکرپٹ میں پس منظر کی موسیقی اور دیگر صوتی اثرات کی نشان دہی کرنے پر ہی قادر ہوتا ہے جن کے بغیر ریڈیو ڈرامہ کا اسکرپٹ ادھورا ہے۔

1936 کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن ڈراموں کا مرکز تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو کے کئی مشہور افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ریڈیو میں ملازم ہوگئے تھے۔ ان

لوگوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک اپنی اپنی جگہ ایک ادارہ تھے۔ ان دنوں لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ریڈیائی ڈرامے کی الگ ایک امتیازی حیثیت ہے، اس لیے اس دور کے سب مصنفین نے جب اپنے ریڈیائی ڈرامے چھپوائے تو ان کے منظر نامے وغیرہ لکھ کر انھیں اسٹیج کے ڈراموں کی صف میں لا کھڑا کیا — میں اسے ''ادبی بددیانتی'' تو نہیں کہہ سکتا لیکن ریڈیائی ڈرامے کے فن نگارش کے ساتھ ''بے وفائی'' ضرور کہہ سکتا ہوں — اور اس بے وفائی میں قریب قریب سب ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ کرشن چندر، منٹو، اشک، بیدی سب کے ریڈیائی ڈرامے یک بابی یا سہ بابی ریڈیائی ڈراموں کے روپ میں چھپے ہیں۔ حالانکہ ان کی تخلیق کا سہرا ریڈیو کو حاصل ہے۔

لکھنؤ بھی آزادی سے پہلے ریڈیائی ڈرامے کا اہم مرکز تھا۔ وہاں عشرت رحمانی اور شوکت تھانوی جیسے عظیم ڈرامہ نگار ریڈیو کے اسٹاف میں تھے — غرض لاہور، پیشاور، دہلی اور بمبئی سے ان دنوں نشر ہونے والے ڈراموں کے بہت سے اسکرپٹ نایاب ہیں۔ دہلی ریڈیو سے انصار ناصری کے نشر شدہ ڈراموں کو بھی ادب کی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں نام گنانا مقصود نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کیونکہ گذشتہ ساٹھ پینسٹھ سال میں سینکڑوں لوگوں نے ہزاروں ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ہوا میں اڑ گئے۔ کچھ ایسے لوگوں کے نام اس معنی میں آئے ہیں جو ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں لجنڈ بن گئے۔

ڈاکٹر محمد حسن ریڈیو میں ملازم تو نہیں تھے، مگر ان کو ریڈیو سے بہت قربت تھی چنانچہ انھوں نے بہت سے ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے اپنے کچھ ریڈیائی ڈراموں کو اسی طرح شائع کیا جس طرح ریڈیائی تکنیک میں لکھا تھا۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' کے ڈرامے اس امر کی مثال ہیں اور اس سے ان کی خود اعتمادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ریڈیائی ڈرامے کی تحریر اور پیشکش کو ایک الگ فن کی حیثیت سے

یونیورسٹی کی سطح پر منواتے ہیں ڈاکٹر محمد حسن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

— بہر حال مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ریڈیائی ڈرامے کو اہل نظر کا اعتماد حاصل ہو چکا ہے۔ ادب میں ریڈیو ڈرامے نے اپنی جگہ بنالی ہے اور ماہرین تعلیم کی میڈیا میں دلچسپی کی وجہ سے ریڈیو ڈرامہ یونیورسٹیوں کی سیڑھیوں پر چڑھ چکا ہے — جگہ جگہ ماس کمیونی کیشن سینٹر کھل گئے ہیں۔ اس سلسلے میں اولیت کا سہرا جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سر ہے۔ ان حالات میں ریڈیائی ڈرامے کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں — دراصل ریڈیائی ڈرامہ ہی ہے جو ریڈیو پروگراموں کو تکنیکی طور پر امتیازی شان بخشتا ہے۔ ورنہ گانے، تقریریں، مباحثے، خاکے، کہانیاں، نظمیں اور غزلیں وغیرہ تو آپ ریڈیو کے باہر بھی سن سکتے ہیں۔ ریڈیو کا سرمایہ افتخار ہے ریڈیائی ڈرامہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

حوالہ

1 ۔ سرگذشت: ذوالفقار علی بخاری، ص 8-7

2 ۔ سرگذشت، ص 118-117

3 ۔ سرگذشت، ص 32

4 ۔ سرگذشت، ص 121

5 ۔ سرگذشت، ص 163-162

انوار احمد خاں

اردو کی ترویج واشاعت میں ریڈیو کا حصہ

زبان کی ترویج واشاعت میں شعوری کوشش وکاوش سے زیادہ ناگزیر ضرورتوں اور تقاضوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ جب سماجی زندگی کی تمام ضرورتوں کے لیے میڈیم کے طور پر کوئی زبان برتی جانے لگے تو اس زبان کی ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ فورٹ ولیم کالج کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کالج کا قیام ہندستانی زبانوں کی ترقی کے لیے عمل میں نہیں آیا۔ مقصد تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اور سیاسی ضرورتوں کی تکمیل تھا۔ لیکن بہر حال زبانوں کو فائدہ پہنچا۔

ہندستان میں ریڈیو کی نشریات کا سلسلہ ویسے تو 1924 - 1923 میں شروع ہوگیا تھا لیکن منظم اور باقاعدہ نشریات کا سلسلہ 1936 سے ہی مانا جاتا ہے۔ جب پہلی جنوری سے دہلی اسٹیشن نے کام کرنا شروع کیا۔ لائنل فیلڈن، غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک، ادارے کی سربراہی کے لیے بی بی سی سے لائے گئے تھے۔ ادارے کا نام آل انڈیا ریڈیو ان ہی کی دین ہے۔ بول چال کی زبان کی فیلڈن ریڈیو نشریات کی زبان سمجھتے تھے۔ انھیں جلد ہی اپنی پسند کے اور غیر معمولی تخلیقی ذہن رکھنے والے دو ساتھی

ہاتھ آ گئے جوان کے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ ایک اردو کے صاحب طرز ادیب احمد شاہ بخاری پطرس اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آل انڈیا ریڈیو نے اپنے ابتدائی گیارہ بارہ سال کے تشکیلی دور میں، اردو زبان کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ ریڈیو پر جو زبان ہندستانی کے نام سے استعمال ہوئی تھی وہ دراصل آسان اور بول چال کی اردو تھی۔ ریڈیو کی سب سے بڑی خدمت علمی، ادبی اور سائنسی معاملات کے اظہار کی سطح پر زبان کو بول چال سے قریب تر لانا ہے۔ بخاری برادران، خاص طور پر ذوالفقار علی بخاری کی شخصیت اور کوششوں نے اس وقت کے نامور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور فن کاروں کو نشریات سے روشناس کیا اور انھیں تحریر کی زبان کی جگہ لکھنے کے لیے بھی بول چال کی زبان کی طرف راغب کیا۔ اس دور میں اردو کا شائد ہی کوئی قلم کار ایسا ہوگا جس نے ریڈیو سے اپنا رشتہ نہ جوڑا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور کے ریڈیو ٹاکس کا مجموعہ 1942 میں چھپا تھا۔ ''تنقیدی اشارے'' کے نام سے چھپی اپنی کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر سرور لکھتے ہیں:

> ''آسان زبان سے یہ مطلب نہیں کہ ادیب اپنے انداز کو چھوڑ دے یا زبان کے مخصوص آب ورنگ کو ترک کردے۔ بلکہ وہ اپنے انداز کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائے اور اپنے سامعین کے حلقے کو وسیع کرلے۔ ریڈیو کا کام نہ تو محض سب کو ہنساتے رہنا ہے، نہ محض نصیحت کرنا اور نہ صرف اطلاع کرنا، اسے تو کام کی باتوں کو گوارا بنا کر پیش کرنا ہے۔ اسے حقائق کو دلچسپ اور دلچسپی کو مفید بنانا ہے۔ اسے عوام کو ساتھ لینے کی خاطر ان کی زبان میں بات کرنا اور ان ہی کی سطح پر ان سے ملنا ہے۔ مگر اسے اس سطح پر رہنا نہیں بلکہ اسے رفتہ رفتہ بلند کرتے رہنا ہے۔ اسے یہ بات ذہن نشیں کرنا ہے کہ

ادبی مسائل یا علمی مسائل بھی زندگی کے ضروری مسائل ہیں
اور اچھی مفید اور ترقی پذیر زندگی کے لیے ان سے بھی آشنا
ہونا ضروری ہے۔''

مذکورہ اقتباس سے پروفیسر آلِ احمد سرور کی دانشورانہ بالغ نظری کے ساتھ ساتھ ریڈیو نشریات کی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ریڈیو خواص کا کلب نہیں، بلکہ عوام کا ادارہ ہے، ماس میڈیا ہے جس کا مقصد عوام وخواص سب کے معیار زندگی اور ذوق کی آبیاری کرنا ہے جسے پبلک سروس براڈ کاسٹنگ کہتے ہیں۔ باتیں مفید اور معیاری اس انداز سے اور اتنی سادہ زبان میں کہنا کہ سب کی سمجھ میں آجائیں۔ میر کا شعر ہے ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پروفیسر سرور نے مذکورہ پیش لفظ میں لکھا ہے کہ تنقیدی اشارے میں شامل اکثر ٹاکس ادبی رسائل میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ کتاب میں شامل آخری ٹاک اردو کے ممتاز طنز ومزاح نگار، رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کے مجموعے ''خنداں'' پر ریڈیائی تبصرہ ہے۔ ''خنداں'' میں شامل تمام تحریریں دراصل رشید احمد صدیقی کی ہلکی پھلکی ریڈیو ٹاکس یا Talks in Lightervein ہیں۔ جو کہ ریڈیو کی ایک الگ صنف ہے۔

''خنداں'' اور ''تنقیدی اشارے'' صرف دو مثالیں ہیں۔ انھیں جزو سمجھیے اور کل کا تصور کیجیے تو آپ آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پچھلے 66-65 سالوں میں ریڈیو نے کتنی چیزیں لکھوائی اور نشر کی ہوں گی جو بعد میں رسالوں اور کتابوں کی زینت بنی ہوں گی۔ جب ہر شاعر، ادیب، دانشور اور اسکالر ریڈیو کے دھارے میں شامل ہوگا تو ادب وتہذیب، تاریخ، سماجیات، فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم وفنون پر تمام ریڈیائی اصناف میں پروگرام نشر ہوتے ہوں گے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ رسالوں اور کتابوں میں محفوظ وہ کتنا بڑا سرمایہ ہے جو اردو زبان وادب کو ریڈیو کی دین ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو کی آمد سے پہلے اخباری صحافت یعنی پرنٹ میڈیم نے بہت ترقی کر لی تھی۔ ریڈیو نے پرنٹ میڈیم کی صحافت سے خوب فائدہ اٹھایا ہوگا۔ لیکن دونوں میدانوں میں بنیادی فرق ہے۔ اخبار کی رسائی شہر اور اس کے آس پاس تک محدود رہی ہے۔ اخبار کے ساتھ دوسری دشواری خواندگی کی شرح کا مسئلہ رہا ہے۔ آزادی سے پہلے خواندگی کی شرح اور بھی کم تھی۔ غالباً 15 فی صدی سے بھی کم۔ ریڈیو نے خواندگی کے Barrier کو توڑا اور شہر اور دیہات کی دوری کو ختم کر دیا۔ جو لوگ اخبار، رسائل اور کتابوں کے قاری نہیں بن سکتے تھے وہ ریڈیو کے معیاری پروگرام سن اور سمجھ سکتے تھے۔ ریڈیو نشریات کا ایک اہم پہلو ابھی بھی ضابطۂ تحریر سے محروم ہے۔ ٹاکس، شاعری، افسانے، خاکے جیسی چیزیں تو لکھ کر رکارڈنگ کے لیے لائی جاتی ہیں اور ان میں سے اکثر چھپ بھی جاتی ہیں۔ لیکن مباحثے، مذاکرے، مکالمے اور انٹرویوز کے میدان میں بھی ریڈیو کا معیار بہت بلند رہا ہے۔ یہ چیزیں چھپ نہیں پائیں۔ یہ زبان وادب کی بہت بڑی محرومی ہے۔ حالانکہ ان پروگراموں کی بہت بڑی تعداد آل انڈیا ریڈیو کی لائبریریوں اور آرکائیوز میں محفوظ ہے لیکن خطرہ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ وہ محفوظ نہ رہ پائیں۔

پچھلے دنوں کچھ مباحثے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون میں چھاپے ہیں جو اس ناچیز نے کوئی دس سال پہلے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ریکارڈ کئے تھے۔ ایسے خوش نصیب پروگراموں کی تعداد بہت کم ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ آل انڈیا ریڈیو نے اپنے ابتدائی دور میں اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمت کی۔ اردو کے اکثر اہم ادیب، شاعر اور دانشور کسی نہ کسی سطح پر ریڈیو کلچر سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان میں بہت بڑی تعداد نے فل ٹائم کارکن کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، ن۔م۔ راشد جیسے ناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ تقسیم ملک اور اس کے بعد کے زمانے میں یہ رفتار کچھ دھیمی ہوگئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ حالات پھر بہتر ہوئے۔ اس وقت صورت حال

یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے 36 اسٹیشنوں سے اردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سب سے بڑی سروس ہے جو روزانہ سوا بارہ گھنٹے پروگرام نشر کرتی ہے۔ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے آل انڈیا ریڈیو کے پاس غیر معمولی Potential اور مواقع ہیں۔ اب یہ اردو والوں پر منحصر ہے کہ وہ ان مواقع کو کس حد تک بروئے کار لاتے ہیں۔

عابد رضا بیدار نے خدا بخش خاں اورینٹل لائبریری پٹنہ میں اپنے قیام کے دوران، اردو میں دانشوری کی روایت پر ایک سمینار کرایا تھا۔ اس سیمینار میں پڑھے گئے مضامین کے ساتھ، اردو میں دانشوری کی روایت پر اہم مضامین کا انتخاب چھپ چکا ہے۔ چند سال پہلے اس کتاب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت وہ کتاب دستیاب نہیں ہوسکی۔ ذہن میں محفوظ دھندلے خاکے کی بنیاد پر یہ عرض کرنے کی جسارت کررہا ہوں کہ سرسید اوران کے رفقاء، چراغ علی، محسن الملک، شبلی، نذیر احمد اور حالؔی نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی اور امیر علی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر سید عابد حسین وغیرہ نے جس کی آبیاری کی — اب وہ کافی حد تک ماندی پڑگئی ہے۔ اس ناچیز کا سمجھنا ہے کہ دانشوری کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں ریڈیو نے پچھلے 65-60 سالوں میں قابل لحاظ خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، سید عابد حسین وغیرہ دانشوروں کا آل انڈیا ریڈیو کو بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نے اردو زبان وادب کو ڈرامے کی ریڈیائی شکل بھی دی ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اپنی کتاب ''اردو – ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' میں لکھتے ہیں:

> ''ذوالفقار (علی بخاری) اسٹیج ڈراموں کے ماہر ہونے کے باوجود، اسٹیج ڈراموں کی تکنیک کو ریڈیو سے الگ رکھ کر، جدید ریڈیو ڈراموں کے موجد بنے۔ اردو میں ریڈیو کی اس صنف

میں پہل کرنے کا نام انھیں کا رہے گا۔'' [صفحہ۴۴۲]

اس ضمن میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''شروع میں جب ریڈیو کے لیے ڈرامے نہیں لکھے گئے تھے تو اسٹیج کے لیے جو ڈرامے فراہم تھے۔ ان میں ریڈیو کی ضروریات کا لحاظ نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر پارسی تھیٹر کے ڈرامے، خاص طور سے آغا حشر کے لکھے ہوئے ''یہودی کی لڑکی'' یا شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجمے یا پھر یونانی ڈراموں کے ترجمے نشر ہونے لگے۔ اس کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ ریڈیو کا میڈیم صرف صوت وصدا کا میڈیم ہے، اور سننے والے اپنے تصور میں منظر تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے آواز اور اس کے اتار چڑھاؤ کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔''

ذوالفقار علی بخاری ریڈیو میں آنے سے پہلے شملے میں اسٹیج ڈرامے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے مطابق اسی وجہ سے فیلڈن نے انھیں ریڈیو کے لیے منتخب کیا تھا۔ لیکن ریڈیو میں آنے کے بعد ان کا میڈیم اور میدان صرف اور صرف ریڈیو تھا۔ وہ اظہار کے ہر وسیلے کو ریڈیو کے فریم ورک میں ڈھالنے کی غیر معمولی دھن رکھتے تھے۔ اپنی خودنوشت ''سرگذشت'' میں صفحہ ۱۵۹ پر لکھتے ہیں:

''میرا قصور یہ تھا کہ میں سرپھرا تھا۔ ہر معاملے میں اپنی منوانا چاہتا تھا۔ بچپن کے زمانے میں میری کون سنتا تھا۔ اب جوانی میں جو مجھے موقع ملا تو بچپن کی ساری کسر نکالنے لگا۔ جو بات ہو منوا کر چھوڑوں اور اگر نہ مانی جائے تو مارنے مرنے پر تیار ہو جاؤں۔

میں نے کہا یہ اردو میں تین گھنٹے کے ڈرامے غلط بات

ہے۔ ریڈیو پر اتنے لمبے ڈرامے نہیں ہونے چاہئیں۔ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر ڈرامے میں گانوں کی بھر مار ہو۔ اسٹیج پر تو یہ گانوں کی بھر مار چل جاتی ہے لیکن ریڈیو پر نہیں۔ ریڈیو کے ڈرامے آدھ آدھ گھنٹے یا پون پون گھنٹے کے ہونے چاہئیں۔ اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔

جب یہ مختصر ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے تو ایک طوفان آ گیا۔ اخبارات نے یک زبان ہوکر کہا کہ ڈرامہ بغیر موسیقی کے ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ بھی کہا کہ وہ ڈرامہ ہی کیا جو ڈھائی تین گھنٹے کا نہ ہو۔ مگر ہم اپنی بات پر اڑے رہے۔ اب کیا بتاؤں کہ یہ ہماری ہٹ دھرمی تھی یا وفاداری بشرط استواری، بہر حال ہم اپنی منوا کر رہے۔ اسی ہٹ دھرمی کا نتیجہ کہیے یا کچھ اور کہ آج ریڈیو کا ڈرامہ مختصر ہوتا ہے اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔''

بہر حال بہت ہی کم دنوں میں ریڈیو ڈرامے نے، ایک صنف کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی۔ فکشن کے اکثر معروف قلمکاروں نے ریڈیو ڈرامے لکھے۔ عشرت رحمانی نے اپنی کتاب ''اردو ڈراما کا ارتقا'' میں ریڈیو ڈراما لکھنے والوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ سب کے سب اردو کے نامور قلم کار ہیں۔ چند نام یہ ہیں۔

امتیاز علی عرشی، سید انصار ناصری، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، سید عابد علی عابد، راجندر سنگھ بیدی، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ریوتی سرن شرما، ممتاز مفتی، راجہ مہدی علی خاں، حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری، سلام مچھلی شہری، کرتار سنگھ دگل۔

باقی نام بھی سب کے سب اہم ہیں۔ ریڈیو کے لیے لکھے گئے زیادہ تر ڈرامے رسالوں میں اور پھر کتابی شکل میں چھپتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر

محمد حسن کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ان کے ریڈیائی ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بہر حال یہ ریڈیو کی بہت مقبول صنف ہے جس نے اردو زبان و ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں، میرے نزدیک ،ریڈیو کی سب سے بڑی خدمت، بہر حال، علمی اور ادبی اظہار کے لیے بول چال کی عام فہم زبان کو رواج دینا ہے اور خواندگی کے Barrier کو توڑنا ہے۔ زبان کے سلسلے کی ایک اور اہم بات پر میں آپ سے اجازت لینا چاہوں گا جو ریڈیو کلچر میں داخلے کا میرے لیے پہلا سبق تھا۔ آج سے بیس سال پہلے جب میں مہاراشٹر کے تاریخی شہر اورنگ آباد ریڈیو جوائن کرنے جا رہا تھا تو اپنے بزرگ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی سے آکاش وانی بھون میں ملنے گیا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں بڑے پتے کی بات یہ بتائی کہ اورنگ آباد، دکن کا علاقہ ہے وہاں کی اپنی انفرادیت ہے۔ مقامی لب و لہجے کو اہمیت دینا اور دہلی، لکھنؤ اور علی گڈھ کے انداز پر اصرار مت کرنا۔ لسانیات کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں اس بات کی باریکی کو سمجھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر شکیل اختر

ریڈیو کے اردو پروگرام: معیار و مسائل

اردو زبان کے ارتقائی سفر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ زبان مختلف مراحل طے کر کے ادبی زبان بنی ہے۔ اس سے قبل کہیں اسے ریختہ تو کہیں لشکری تو کہیں ہندستانی کہا جاتا تھا۔ اس کی نشو و نما میں آبادیوں کے تبادلے اور لشکری خصوصیات نے اس کی ترسیل میں بخوبی اضافہ کیا۔ اردو ابتداء سے ہی ترسیل اور رابطے کی زبان رہی ہے۔ کبھی اس نے مختلف زبان بولنے والے لشکروں کے درمیان رابطے کا کام کیا تو کبھی کوچہ و بازار میں ایک دوسروں کو سمجھنے اور سمجھانے یا رابطے کا کام کرتی رہی۔ دراصل زبان ابلاغ کی وہ مخصوص صورت ہے، جس میں زبردست ترسیل کی قوت پنہاں ہوتی ہے۔ جس طرح اچھی اور معیاری شاعری کے لیے دنیا کی چند مخصوص زبانیں ہی زیادہ موزوں ہیں جن میں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اردو دوسری زبانوں کی نسبتاً ترسیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، کیوں کہ اس زبان کی خمیر کو تیار کرنے میں فارسی، آریائی، افغان، ترک اور ازبک زبانوں کے علاوہ ہندستان کی دیسی بولیوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے، جس سے زبان

میں بے پناہ قوت پیدا ہوئی اور شاید اردو کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر یہ تحریک آزادی کی زبان بھی بنی۔ آج پورے ہندستان میں تحریک آزادی سے متعلق جتنا سرمایہ اردو میں محفوظ ہے، وہ شاید ہی کسی زبان میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک آزادی کے دوران اردو ہی پورے ملک میں رابطے کی زبان بنی رہی اور آج بھی یہ ایک Lingua Franka کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیا وجوہ تھیں کہ انگریزوں نے کلکتہ کے فورٹ ولیم سے بذریعہ دوربین دلی کی گلیوں میں اس چونچال بچے کو دیکھ کر اسے حکومت وقت کی زبان بنانے کا فیصلہ کیا اور لگ بھگ اپنی سوسالہ دور حکومت کے دوران فرنگیوں نے اپنے مافی الضمیر کو اسی زبان میں بیان کیا۔ اس کی اہم وجہ اس زبان کی ترسیل کی خصوصیات اور صلاحیتیں تھیں جب کہ ہندستان کی دوسری زبانوں کا علاقہ محدود تھا لیکن انتظامی امور کے لیے رابطے کی زبان اردو ہی تھی۔ زبان کی اس تصویر کا ایک رخ فلموں میں اردو زبان کا استعمال ہے جس سے اردو کو فروغ بھی ملا اور فلمی صنعت کو استحکام بھی۔

ریڈیو بیسویں صدی کی وہ اہم ایجاد ہے، جس نے انسانی ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ ماس میڈیا کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس کے ذریعہ ہم سکنڈوں میں سامعین کے درمیان پہنچ جاتے ہیں۔ اس میڈیم کے ذریعہ ہم عوام کے سبھی طبقوں سے مختلف پروگراموں کے ذریعہ مخاطب ہوتے ہیں جس میں ان کی دلچسپی اور معیار کا خیال رکھا جاتا ہے۔ خبروں، تفریحی اور معلوماتی پروگراموں کے ذریعہ ہم سامعین تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

ہندستان میں نشریات کی ابتداء سے اردو کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اسے ترسیل کی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔ خواہ اسے اس زمانے میں ہندستانی ہی کیوں نہ کہا جاتا تھا، لیکن ہندستانی اردو ہی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری طرف خوش قسمتی سے اس نئے ماس میڈیم کو آغاز میں پطرس بخاری اور ان کے احباب کے علاوہ اردو زبان وادب کے ایسے درخشاں ستارے ملے جنھوں نے اس نئے میڈیم کے تقاضوں کو تابانی بخشی۔ یہ اردو کا وہ دور ہے جس میں بڑے بڑے ادیب، شاعر اور ناقد پیدا ہوئے۔ اس

زمانے کے اردو داں حضرات نے نہ صرف اردو میں ادبی پروگرام پیش کئے بلکہ مختلف النوع پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ترجمان رسالہ ''آواز'' کے شماروں میں ایسی کاوشوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری گفتگو کا موضوع ''ریڈیو کے اردو پروگرام: معیار ومسائل'' ہے۔اس لیے ہم ریڈیو کے کسی مخصوص اردو پروگرام کے حوالے سے گفتگو نہ کرکے بلکہ ریڈیو کے وہ تمام پروگرام جو اردو میں نشر کئے جاتے ہیں پر بات چیت کریں گے۔ ریڈیو کے پروگرام مختلف سطحوں پر نشر کئے جاتے ہیں۔مثلاً تفریحی پروگرام، خبریں، تبصرے، ادبی پروگرام، ڈرامے، فیچرس، ٹاکس، زراعت، صحت، اسپورٹس، انٹرویوز اور Special Audience Programme وغیرہ۔ان پروگراموں میں تفریحی پروگرام کی زبان نہایت سادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس پروگرام کے سننے والوں کا حلقہ نہایت وسیع ہوتا ہے اور سبھوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اس کے برعکس خبروں، تبصروں اور حالاتِ حاضرہ کے پروگراموں کی زبان ذرا مشکل ہوتی ہے کیوں کہ ان میں اصطلاحات کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ادبی پروگراموں، مذاکروں، ڈراموں فیچروں، دستاویزی فیچروں اور O.B. Based Feature کی زبان بھی قدرے مختلف ہوتی ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار پروگرام کے موضوع پر ہوتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان پروگراموں کا معیار کیا ہے۔آج ہر طرف معیار کا رونا ہے اور زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں معیار میں گراوٹ نہ آئی ہو، خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔آج ہمارے اردو اداروں کا معیار کیا ہے اس سے آپ سبھی بخوبی واقف ہیں۔ معیار جس کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں اور علوم پر ہوتا ہے، کا کوئی ایک متعین پیمانہ نہیں ہے، بلکہ اس کا انحصار فرد کی صلاحیت پر ہوتا ہے اور فرداً فرداً یہ تبدیل ہوتا رہتا ہے ۔ریڈیو پروگرام اور زبان کے حوالے سے معیار سے متعلق، میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس کا تعلق ریڈیو کے تقاضوں اور زبان کے استعمال کرنے والوں کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔اردو ادب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ہر شاعر اور

ادیب کا اسلوب اور معیار الگ ہوتا ہے۔ دراصل معیار کے پس منظر میں کسی بھی فرد کا تجربہ، صلاحیت، علمیت، الفاظ کے رموز و نکات سے واقفیت، عمیق مطالعہ اور زبان پر دسترس جیسی صلاحیتیں مخفی ہوتی ہیں۔ ریڈیو کی زبان تحریری زبان کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور جامع ہوتی ہے تاکہ فوراً ترسیل ہو سکے۔

اس پس منظر میں جب ہم ریڈیو پروگراموں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان پروگراموں کے معیار کا کلی انحصار ریڈیو کے ذمہ داران پر نہیں ہوتا بلکہ اسے آپ کی جانب سے جو کچھ بھی ملتا ہے اسے سامعین تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان تحریریں میں تقاضوں اور پالیسیوں کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے، لیکن پھر بات وہیں پہنچتی ہے کہ ریڈیو پروگراموں کا معیار بھی فرداً فرداً بدلتا رہتا ہے، جی ہاں اس کا زیادہ تر انحصار ریڈیو کی تحریر لکھنے والوں پر ہوتا ہے۔ آج ہم شمیم حنفی، ڈاکٹر نجمہ حسن، گوپی چند نارنگ، پروفیسر مظفر حنفی، تنویر احمد علوی، محمود ہاشمی، زبیر رضوی، کمال احمد صدیقی، رفعت سروش، مظہر امام، شریف الحسن نقوی، خواجہ حسن نظامی کے علاوہ نئی نسل میں چند ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب ایسے ہیں کہ انھیں جب بھی کوئی موضوع دیا جاتا ہے تو وہ اسے جیتا جاگتا بنا دیتے ہیں اور ان کی تحریریں ہمارے لیے معیار بن جاتی ہیں۔ ریڈیو کے پروگراموں کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو اس کے معیار کا تعین مخاطب کرتا ہے یا پھر مُخاطب کرتا ہے۔ اس طرح اردو حلقے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا معیار متعین کرے اور بالخصوص اردو کے ادبی پروگراموں کا۔ ریڈیو کے نزدیک معیار کا تو صرف ایک ہی پیمانہ ہے کہ جو پیغام پہنچانا ہے وہ صحیح اور مؤثر طریقے سے پہنچایا جا سکے۔ کبھی کبھی بعض پروگراموں کے لیے ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوسکتا ہے، لیکن ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ آج ریڈیو کو صرف غالب اور میر پر تقریر لکھنے والے اور مشاعرہ پڑھنے والے شعراء ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خلائی سائنس، نیوکلیر سائنس اور دوسرے جدید علوم پر بھی سیر حاصل بحث کرنے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ آج ہمارے ادارے ادیب تو پیدا کر رہے ہیں اور ان کا بھی معیار کیا۔

اس سے بھی واقف ہیں لیکن آج ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے جو صرف زبان و ادب کے علاوہ عصری علوم سے بھی واقف ہوں، کیوں کہ زندگی کا کینوس بہت وسیع ہو چکا ہے۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف چند ادبی ریڈیو ٹاکس، ڈرامے یا مشاعرے نشر کر دیے جائیں بلکہ ریڈیو سے اردو میں تمام زمروں سے متعلق پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کا اردو میں مختلف النوع کے رنگا رنگ پروگراموں اور مختلف سطحوں پر پروگرام پیش کرنے کا سہرا اردو سروس کو حاصل ہے اور یہ ادارہ اس جانب پیش رو کا درجہ رکھتا ہے۔ ریڈیو سے ادب کے علاوہ سائنس، سماجی علوم، فلسفہ، تواریخ اور دوسرے مختلف علوم پر نشریے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کے ماہرین کی ضرورت ہے لیکن اکثریت ایسے ٹاکروں کی ہوتی ہے جو اپنے علمی میدان کے تو ماہر ہوتے ہیں مگر زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا یا اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

اردو میں نشریاتی ادب کی ایک اچھی روایت ہے جس میں ادبی پروگراموں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے، جس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندستان میں ریڈیو کے ابتدائی دور میں کس طرح ہمارے اکابر نے اس نئے میڈیم کو زبان کے حوالے سے ایک مخصوص معیار تک پہنچایا تھا۔ یہاں میں خواجہ حسن نظامی کی مثال دینا چاہوں گا کہ ان کی آواز، انداز اور تحریر ریڈیو کے لیے کس درجہ مناسب تھی۔ ان کی نشری مضامین کا مجموعہ ''کانا باتی'' میں یہ خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں اور اس پر سیر حاصل بحث بھی کی جا سکتی ہے۔ ان حوالوں سے اور بالخصوص ریڈیو کے ادبی پروگراموں کے معیار کے تعین کی ذمہ داری اردو کے اہل قلم پر ہے۔ ادبی پروگرام کے حوالے سے مزید یہ کہنا چاہوں گا کہ ان پروگراموں کے لیے باقاعدہ اسکوپ بتایا جاتا ہے کہ آپ کو کس موضوع پر اور اس کے کس کس پہلو پر لکھنا ہے۔ یہاں ایک ادبی پروگراموں کے اسکوپ کو پڑھ کر سنانا چاہوں گا۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ محض ایک ٹاک کو شیڈول کرنے میں فکر و عمل کی کتنی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نشری سلسلہ تقاریر کا عنوان ہے غالب بصد انداز جو Ghalib in Hundred Moods کا بہترین ترجمہ ہے۔ یہ سلسلہ انوار احمد خاں

نے شروع کیا تھا۔
غالب کے دوسوسالہ جشن ولادت سے متعلق تقریبات کے سلسلے میں ہم نے اپنی نشریات کے لیے تقریر کے ایک سلسلے کا اہتمام کیا ہے جس کا عنوان غالب بصد انداز ہے ان تقریروں کے لیے ہم نے ،غالب کے ایسے اشعار یا مصرعے کا انتخاب کیا ہے، جو غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔
کوئی شعر یا مصرعہ پہلی نظر میں غالب شناسوں کو، کس طرح متاثر کرتا ہے۔ ان کے ذہن میں غالب کا کون سا پہلو اور اس سے متعلق دیگر اشعار آتے ہیں اور بالخصوص غالب اور غالب کے حوالے سے (بالعموم) اردو کی شعری روایت پر اظہار خیال کے لیے کیا تحریک پیدا ہوتی ہے— آزادانہ طور پر یہی اس مخصوص تقریر کا موضوع ہوگا جسے ہم عنوان کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔
اس سلسلۂ تقاریر کے تحت لگ بھگ 25 تقریریں نشر کی گئیں اور اس کے لیے اردو کے معروف ادیبوں کو دعوت دی گئی۔اس سے قبل مشرق ومغرب کی شہرۂ آفاق تصنیفات کے ان اہم کرداروں پر اردو سروس کا نشریاتی سلسلہ تقاریر بھلائے نہ بنے جو قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گیا اس سلسلے کے تحت لگ بھگ چالیس تقریریں نشر کی گئیں۔اب ان تقاریر کے معیار کو متعین کرنے کی کس کی ذمہ داری ہے ہم نے تو ایک کھنچے ہوئے خطوں کے اندر ان تقاریر کو سامعین تک پہنچا دیا اب باقی کام آپ کے ذمہ۔ ہاں ان پروگرام کی تکنیکی اتار چڑھاؤ کی ذمہ داری ہماری ہے۔اب آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں مسائل پر۔آج مختلف سطحوں پر ماس میڈیا کی تعلیم کا انتظام ہے اور اس کا اثر روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے۔دلی کی یونیورسٹیوں میں کسی نہ کسی سطح تک یہ تعلیم دی جارہی ہے،ان اداروں کے پاس آج بھی وسائل کی زبردست کمی ہے اور یہاں تدریس کا سلسلہ صرف نظری اسباق تک محدود ہے۔ ان اداروں میں ریڈیو اور ٹی.وی کے مختلف پروگراموں کو دیکھنے اور سننے کا بندوبست بھی نہیں ہے تاکہ وہ کسی ایک پروگرام کو سن کر اس پر کوئی رائے قائم کرسکیں۔ اردو میں ماس میڈیا کی کتابوں کی سخت ضرورت ہے لیکن یہ کتابیں صرف

نظری اسباق پر مشتمل نہ ہوں بلکہ اس میں ریڈیو، ٹی وی پروگراموں کے عملی مشق کو بھی شامل کیا جائے۔ میرے خیال میں ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کی اگر پوسٹ پروڈکشن اسکرپٹ شائع کی جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ریڈیو کے اردو ڈراموں کے حوالے سے آج ایک زبردست چیلنج یہ ہے کہ اگر ریڈیو کی اچھی اسکرپٹ آپ کے ہاتھ لگ جائے تو اسے اس زبان کی جاننے والے ڈرامہ آرٹسٹ میسر نہیں ہیں۔ ان تمام مسائل کے باوجود ریڈیو آج بھی اپنے مقدور کے مطابق سامعین کی خدمت کر رہا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے ہمارے اردو ڈرامے بھی نہایت کامیاب رہے ہیں اور بعض ڈراموں کو آکاش وانی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو سری نگر، حیدر آباد اور اردو سروس دلی سے ہی باقاعدہ اردو ڈرامے براڈ کاسٹ کئے جا رہے ہیں جبکہ 35 دوسرے اسٹیشنوں سے دوسری نوعیت کے اردو پروگرام براڈ کاسٹ کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سرفہرست اردو سروس ہے جو روزانہ سوا بارہ گھنٹے کا پروگرام نشر کرتی ہے۔

اردو سروس کی کارکردگی سبھوں کے سامنے ہے اور اس نے اپنی ایک بین الاقوامی شناخت قائم کی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے پڑوسی ملک کے بہت سے سامعین اچھی اور معیاری اردو سے مستفیض ہونے کے لیے اپنے لوگوں کو اردو سروس کے پروگرام سننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پاکستان کے چند انتہائی بڑے کہانی کار، شاعر، نقاد اور دیگر فنکار بھی اردو سروس کے دلدادہ ہیں۔ اس لیے اردو نشریات کے معیار کے بارے میں کوئی بات طے کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دنیا کی ایک بڑے نشریاتی سروس یعنی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروسوں کے تمام پروگراموں پر نظر ڈالی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ایسا کرنے سے اردو نشریات کے معیار کا معاملہ نہیں اٹھے گا۔ یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ ریڈیو سری نگر، حیدر آباد اور اردو سروس کے علاوہ باقی تمام اسٹیشنوں سے بہت ہی محدود اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں کہیں نصف گھنٹہ، کہیں پون گھنٹہ تو کہیں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔ اس لیے ان ہی اسٹیشنوں کے براڈ کاسٹ ہونے والے پروگراموں کو معیار پر پرکھا جاسکتا ہے۔

حسن مثنیٰ

ریڈیو ڈاکومنٹری نگاری کا فن

موجودہ دور عوامی ذرائع ترسیل کے انقلاب کا دور ہے جس کے فروغ میں بیسویں صدی کا کردار نہایت ہی اہم ہے۔ اس صدی کی آخری دہائیوں میں عوامی ذرائع ترسیل کی بے پناہ ترقی نے تمام عالم انسانیت کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ریڈیو ذرائع ابلاغ میں سے ایک ہے گو کہ آج T.V, Internet, Computer, Mobile Telephone, کا دور دورہ ہے پھر بھی ریڈیو کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور ریڈیو اپنی افادیت و معنویت برقرار رکھنے میں آج بھی اسی طرح کامیاب ہے جیسا کہ آغاز میں تھا۔ یہ ایسا ذرائع ابلاغ ہے جس کے ذریعہ ہمیں مختلف قسم کی اطلاعات، خیالات، تجربات اور نظریات بہم پہنچتی ہیں نیز علوم وفنون، تفریحی مواد، حالات حاضرہ، عوامی مسائل اور دیگر بہت ساری معلومات بھی نہایت سرعت سے ہم تک موصول ہوتی ہیں۔ خصوصی طور پر ریڈیو نے ہندستانی تہذیب وثقافت کو بہت فروغ دیا ہے۔ خواہ اس میں ادب وشعر ہو یا موسیقی اور دوسرے علوم وفنون سبھی کی اعلیٰ قدریں ریڈیو کی مرہون منت ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا Target

ایک بہت بڑا انسانی گروہ ہوتا ہے جو ہر وقت تمام معلومات سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔
ریڈیو کے سامعین کا وسیع حلقہ اور عوام میں اس کی مقبولیت ہی اس کی کامیابی کی سب
سے بڑی دلیل ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ ہمارے دلوں پر آواز کے ذریعہ حکومت
کرتا ہے جس میں نہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی دیکھنے کی کوشش کرنی پڑتی
ہے۔ جب کہ ان کے علاوہ دیگر تمام ذرائع ابلاغ میں جن میں اخبار، رسائل، کتب، فلم
وغیرہ یہاں تک کہ T.V اور Internet سبھی کا رشتہ ہمارے آنکھوں سے ہوتا ہے۔ ان
سبھی میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ یہ سبھی ذرائع ابلاغ ہر کس وناکس کی پہنچ سے باہر
ہیں۔ یعنی دیہی علاقہ کے لوگ غیر خواندہ یا نیم خواندہ افراد جن کے گھروں میں ابھی تک
بجلی نہیں پہنچ پائی ہے وہ ان ذرائع میں سے بیشتر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے
برخلاف ریڈیو ان ساری خامیوں سے نہ صرف بالاتر ہے بلکہ کم خرچ بالانشیں بھی ہے۔
یہ نہ صرف سستا ذریعہ ابلاغ ہے بلکہ اس کی رسائی عام آدمی تک ہے۔ اس کی سب سے
بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ Portable ہوتا ہے جسے بآسانی کہیں بھی لے جایا
جا سکتا ہے۔ اس کی آواز بند کمروں میں بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسے ہم
سفر یا حضر ہر جگہ ساتھ رکھتے ہیں۔ T.V کی آمد کے بعد یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ریڈیو
بھی کہیں خاموش فلموں کی طرح اپنی معنویت نہ کھودے اور آثار قدیمہ کی چیز بن کر نہ رہ
جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اس کی خالص وجہ اس کی سرعت اور Portable ہونا تو ہے ہی کم
خرچ ہونا بھی ہے جسے ہر شخص Afford کر سکتا ہے۔

اس سے قبل کہ ڈاکومنٹری نگاری کے فن سے بحث کریں عوامی ذرائع ترسیل
کی خوبیوں سے متعلق جانکاری حاصل کرلیں تو بہتر ہے یعنی اس آلہ ترسیل سے کون کون
سے کارہائے نمایاں انجام دیے جا سکتے ہیں۔ عوامی ذرائع ترسیل کے عظیم مفکر ڈاکٹر ویلبر
شرم کا خیال ہے کہ بااثر عوامی ذرائع ترسیل ملک کی سماجی، معاشی اور تہذیبی ترقی
میں اہم کردار ادا کرتے ہیں یعنی اس کے ذریعہ سماجی تبدیلی کا کام انجام دیا جا سکتا ہے
عوامی ذرائع ترسیل سے ملکی ترقی میں کافی اہم کام لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ملکی ترقی کے

متعلق معلومات فراہم کرنا یعنی عوام کے ذہن کو ملک میں ہو رہی تیز رفتار ترقی یا یوں کہا جائے کہ ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جانب متوجہ کراتا تو ہے ہی اس کے ذریعہ تبدیلی کے مواقع اور ان ذرائع کی تشہیر کرنا بھی ہے جس سے عوام بے خبر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ حد تک عوام کی امیدوں اور خواہشوں کو مہمیز کرنا بھی اس آلۂ ترسیل کا اہم کام ہے۔ عوامی ذرائع ترسیل کا دوسرا کام لوگوں کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا ہے کہ وہ ترقی کے عمل میں حصہ دار بن سکیں۔ اپنی ضروریات کے مطابق عوامی فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں اور یہ بھی ممکن ہے جب حاکم اور محکوم کے درمیان راست رابطہ ہو جو عوامی ذرائع ترسیل کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس کا سب سے بڑا کام عوام کو ترقی حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی ضروری تکنیکی معلومات فراہم کرنا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب انھیں خواندگی، تعلیم، صحت، صنعت و حرفت اور زراعت سے متعلق جدید معلومات فراہم کی جائیں۔ عوامی ذرائع ترسیل سماج میں ترقی اور تبدیلی کا آلۂ کار بن جائیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں یا ماہرین کی خدمت لی جائے جو اس میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر چکے ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تمام ذرائع ابلاغ میں ریڈیو نہایت جامع اور مکمل ذرائع ابلاغ ہے اور اس کی مختلف اصناف ہمیں بے شمار معلومات سے بہرہ ور کرتی ہیں۔ ان میں ڈرامہ، فیچر، ڈاکومینٹری وغیرہ نہایت عمدہ اصناف ہیں جن کے ذریعہ ہم اپنا مافی الضمیر عوام تک بآسانی پہنچا سکتے ہیں یہاں ہم ریڈیو ڈاکومنٹری کی بات کریں گے جو کہ ریڈیو کے دیگر اصناف میں ایک نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کا کینوس نہایت وسیع ہوتا ہے اور اس میں دنیا جہاں کے موضوعات کو سمیٹا جا سکتا ہے۔ جو کہ نفسیاتی، تعلیمی، معاشرتی یہاں تک کہ فلسفیانہ دستاویزات پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ اگر فلسفیانہ موضوعات پر مبنی ڈاکومنٹری کی ہی بات کی جائے تو اس میں عشق و محبت پر مبنی مواد، انتقام سے بھرپور جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے شہ پارے وغیرہ شامل ہو سکتے ہیں جب کہ نفسیاتی موضوعات میں رشتوں پر مبنی دستاویز کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ریڈیو ڈاکومنٹری، ڈرامہ

اور ٹاک کا ملا جلا روپ ہوا کرتا ہے۔ البتہ اس میں خیالی قصے نہیں پیش کئے جاتے۔ ہاں اس میں ٹاک کی طرح بیانیہ ہوتا اور ڈرامہ کی طرح مکالمے بھی ہوتے ہیں گرچہ اس میں حقیقت نگاری کا سہارا لیا جاتا ہے پھر بھی اس میں فیچر کی چند خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس کی پیش کش کے لیے ضروری ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں اس کی تشریح یوں درج ہے:

" Development of readio documentary steemed from draw as writers searched for new material especially approperiate for broadcasting. Not surprisingly, early documentry on well known historical events, of which the profrounces were in effect dramatic constructions. Production of radio documentrary was simplified by the invention of magnetic recording tape that was for easier toedit and use on location than its predecessors, the was coated disc and wire recorder. Ironically just whenthese technical advances had made the best form of radio documentary on contemporary themes began to support its radio counterpart. Documentary have become more expository of public

(current) affairs concerned with international relations, domestic politics and social problems." (Encyclopaedia Britanica 15th Ed. vol-15.p.222)

ایک عمدہ ریڈیو ڈاکومنٹری تحریر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت نگاری کا سہارا لیا جائے اسی نکتہ کے پیش نظر ریڈیو میں اسے ڈاکومنٹری کا نام بھی دیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی تحریر کے لیے ڈاکومنٹری نگار کسی دستاویز کو اپنا ماخذ بناتا ہے۔ جو حقائق پر مبنی ہوتے ہیں یہ دستاویز ہمیں حقیقت سے متعارف کراتے ہیں۔ ہاں اس میں ایک فن کار اپنے قلم کی جولانی کا مظاہرہ احتیاط کے ساتھ کر کے ہمیں حظ فراہم کرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر جھوٹے دستاویزات (Tampered Documents) کی بات چھوڑ دی جائے تو یہ صد صد سچ پر مبنی ہوتے ہیں جن میں کسی موضوع کے حقیقی تناظر کو ملحوظ رکھ کر اپنی بات عوام/سامعین تک پہنچائی جاتی ہے شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ:

" A good documentry chokes us, surprise us, teaches us, new ways to look at the reality we thought, we already knew... A good, documentry changes our perception of reality."

مندرجہ بالا تعریف سے اتنی بات تو واضح ہوگئی کہ ڈاکومنٹری ایک بیانیہ صنف ہے۔ جس میں تحقیق پر مبنی کوئی تحریر موضوع بحث ہوتی ہے جسے حقائق کی بازیافت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں صوتی آوازوں کا اہم مقام ہوتا ہے۔ ان آواز و الفاظ کی نشست و برخاست کے ذریعہ ہم اپنا پیغام عوام تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ڈاکومنٹری نگار رواں اور سلیس زبان استعمال کر کے کسی قسم کی گنجلک خیال سے احتراز کرے اور اپنی بات نہایت سادگی سے کہہ جائے۔ اگر ایسا ممکن ہوا تو ڈاکومنٹری

سامعین کی دلچسپی کا سامان فراہم کرے گی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے گی۔
ڈاکومنٹری نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے ریسرچ کے مراحل سے گذرے اور اپنے موضوع سے متعلق تمام مواد، اعداد وشمار حاصل کرے خواہ وہ موضوع کوئی بھی ہو غربت، افلاس، شہری ترقی، ماحولیاتی آلودگی، سائنسی ایجادات یا پھر دیگر موضوعات کیونکہ ایسا کرلینے سے اسکرپٹ جاندار ہوجاتی ہے اور عوام ان تمام عوامل سے بہرہ ور ہوجاتے ہیں جو وہ جاننا چاہتے ہیں۔ ڈاکومنٹری کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ کسی شہر، تاریخی اہمیت کے حامل شخص، عمارتوں، اداروں، فیکٹریوں یہاں تک کہ تھیٹر گروپ اور این جی او پر بھی ڈاکومنٹری تحریر کی جاسکتی ہے۔ کسی واقعہ، سانحہ یا حادثہ کو بھی موضوع بنا کر ڈاکومنٹری لکھی جاسکتی ہے لیکن شرط وہی ہے، یعنی خوب ریسرچ کی جائے اور کسی بھی نکتہ کو غیر اہم نہ سمجھا جائے۔ نیز اس میں کسی قسم کے تعصب کو شامل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان سبھی حقائق کو من وعن پیش کردیا جائے جو ریسرچ کرتے وقت خام مواد کی شکل میں دستیاب ہوئے تھے۔ اگر ایسا ممکن ہوگا تبھی جاکر ایک عمدہ ڈاکومنٹری تحریر کی جاسکے گی۔ ڈاکومنٹری کو بیانیہ صنف سخن کہا جاتا ہے ظاہر ہے جب ہم اسے ایک بیانیہ صنف سخن مانتے ہیں تو اس میں ایک راوی بھی ہوگا جو واقعات بیان کرے گا اور اسے آگے بڑھائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہاں راوی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے چلیں۔ راوی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حقائق پر روشنی ڈالے اور جب اور جہاں کہیں بھی ضرورت ہو مختلف نکات کی نشاندہی کرتا چلے اس کی تفصیل بیان کرتا جائے یعنی اس کا کام Conduct یعنی (رابطہ کار) کا ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ راوی کو ہرگز ڈاکومنٹری کی روح کو مجروح کرنے کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ اسے کسی بھی موقع پر مخل نہیں ہونا چاہیے اگر کسی ڈاکومنٹری نگار کو ڈاکومنٹری تحریر کرتے وقت ایسا محسوس ہو کہ اس بیانیہ میں راوی زیادہ اہمیت حاصل کرلے گا اور ڈاکومنٹری اپنے فطری بہاؤ سے الگ ہٹ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ حقائق اور دیگر چیزوں کو اس ترتیب سے پیش کرے کہ وہ خود بخود رونما ہوتی

چلی جائیں اور کسی راوی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔اس کے لیے ڈاکومنٹری نگار کو بہت ماہر ہونا پڑے گا کیونکہ یہ طریقہ خاصا دشوار گذار ہے اور ایسا کرنا صرف اسی فنکار کے بس کی بات ہے جو اس فن میں مہارت رکھتا ہو۔ایسے میں صوتی تاثرات اور موسیقی بہت اہم ہو جاتے ہیں کیونکہ راوی کی عدم موجودگی کا کام ان کے اتار چڑھاؤ سے بھی لیا جاتا ہے جو کہ پروگرام ایگزیکٹیو اور ڈائرکٹر وایڈیٹر کی صواب دید پر بھی منحصر ہے۔

مختصراً یہ کہ ایک ڈاکومنٹری نگار کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ سب سے پہلے بیانیہ انداز تحریر پر قدرت رکھتا ہو، خوب ریسرچ کر کے موضوع کا انتخاب کرے اور حقائق سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے، بلکہ اسے من وعن پیش کرنے کی کوشش کرے،اس کی تحریر میں روانی ہو سلاست ہو اور رنگا رنگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سامعین کو اپنی جانب مبذول کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز اس میں طوالت نہ ہو کیونکہ زیادہ طویل ہونے سے سامعین اس سے صرف نظر کر سکتے ہیں۔ ریڈیو Switch off کر سکتے ہیں جو کہ کسی بھی براڈ کاسٹر کے ناکامی کا بین ثبوت ہے۔اس لیے جتنا ممکن ہو کم سے کم وقت میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ایک ڈاکومنٹری نگار کو یہ بھی چاہیے کہ وہ عام فہم الفاظ کا استعمال کرے اور غیر مانوس الفاظ یا اصطلاحات سے اجتناب برتے کیونکہ اس سے سامعین بوجھل ہو سکتے ہیں اور وہ اصطلاحات جاننے سمجھنے کے چکر میں پڑ کر ڈاکومنٹری سننا بند کر سکتے ہیں اگر ایک ماہر سامع اور ریڈیو کا رشتہ ٹوٹ گیا تو بلاشبہ ڈاکومنٹری نگار کی محنت رائگاں چلی جائے گی ، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ رہے گا کیونکہ اس حقیقت سے ہم واقف ہیں کہ ریڈیو میں چیزیں Replay یا Repeat نہیں کی جا سکتیں جو الفاظ ایک بار ادا ہو گئے وہ ادا ہو گئے اگر سامعین اسے گوش گذار نہ کر سکے، سمجھ نہ سکے تو بات جاتی رہے گی اور سامع کو پروگرام کا لطف بھی حاصل نہ ہو سکے گا جو کہ ڈاکومنٹری نگار کے فن کو مجروح کرے گا۔

پروفیسر محمد شاہد حسین

اردو سنیما 1947 تک

1912 تک ہندوستان میں فلمیں خال خال ہی بنتی تھیں، زیادہ تر فلمیں باہر سے آتی تھیں۔ ان میں بھی فرانس کی زیادہ تھیں۔ لیکن امریکہ، اٹلی، برطانیہ، ڈنمارک اور جرمنی بھی ہندوستانی فلمی بازار میں اپنی حصے داری کے لیے کوشاں تھے۔ کیوں کہ ہندوستان عالمی پیمانے پر فلم کی اچھی منڈی تھا۔

تبھی ہندوستانی فلمی دنیا میں ایک غیر معمولی شخصیت نمودار ہوئی اور وہ تھے ڈھنڈی راج گووند پالکے۔ جو دادا صاحب پالکے کے نام سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ دادا صاحب کو حضرت مسیح کی زندگی پر انگریزی فلم دیکھ کر شری کرشن کے حالاتِ زندگی پر فلم بنانے کا خیال آیا، لیکن کچھ مجبوریوں کی بنا پر وہ شری کرشن پر فلم نہ بنا سکے۔ ان کی پہلی فلم ''راجہ ہریش چندر'' کے نام سے بنی۔ جو 1912 میں مکمل ہوئی۔ یہ اپنے وقت کی سب سے لمبی فلم تھی یعنی اس کی لمبائی 3700 فٹ تھی۔ یہ 1913 کی ابتدا میں ممبئی کے کارونیشن سنیما گھر میں پہلی بار دکھائی گئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ دادا صاحب نے مختصر اور پوری لمبائی کی سیکڑوں فلمیں بنائیں جن میں بھیشم سودا مونی، ساوتری، لنکا دہن اور کرشن جنم کافی مشہور ہوئیں وہ زیادہ تر مذہبی فلمیں بناتے تھے۔ پروہت خاندان کے

ہونے کی وجہ سے انھیں اس موضوع پر زیادہ قدرت حاصل تھی، انھوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر برما، سری لنکا اور ایسٹ افریقہ میں ہزاروں کامیاب شو کیے اور ہر جگہ دھوم مچادی۔

مذہبی فلموں کا دور قریب قریب 1920 تک چلتا رہا۔ اس کے بعد سماجی، تاریخی اور نیم تاریخی فلمیں بننے لگیں تو مذہبی فلموں کا زور کم ہوگیا۔ دادا صاحب پالکے 1944 تک زندہ رہے مگر 1920 کے بعد انھوں نے بہت کم فلمیں بنائیں۔

اسی دور میں دو اہم فلمی شخصیتیں کلکتے سے ابھریں۔ دھرین گنگولی اور دیبکی کمار بوس۔ ہندوستانی فلم کی تاریخ میں گنگولی کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں مزاحیہ فلموں کی ابتدا کی۔ ان کی مزاحیہ فلموں میں میرج ٹانک، لیڈی ٹیچر اور انگلینڈ رٹرن کافی مشہور ہوئیں۔

دیبکی کمار بوس نے اسکرپٹ بھی لکھے۔ اداکاری بھی کی اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہندوستانی فلموں کو خصوصی رنگ و آہنگ بخشا، وہ پس منظر موسیقی اور صوتی اثرات کے بھی ماہر تھے۔

اس عہد میں ایک اور فلمی شخصیت ممبئی کے چندولال شاہ تھے۔ انھوں نے کل 130 فلمیں بنائیں۔ جن میں سے ساٹھ فلموں سے بہت اچھا منافع ہوا۔ یہ سب کی سب سماجی فلمیں تھیں۔ یہی وہ فلمیں ہیں جنھوں نے سماجی فلموں کو مذہبی فلموں پر فوقیت دلوائی۔ چندولال شاہ نے جس قسم کی فلمیں بنائیں ان سے بہت سے فلم سازوں کو رہنمائی ملی۔

1927 میں پورے ہندوستان میں 265 پکچر ہال تھے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی فلموں کی مانگ بڑھی۔ مگر ہندوستانی فلمی صنعت اس مانگ کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ غیر ملکی فلموں کی سپلائی بھی یقینی نہیں تھی، انھیں سب پریشانیوں کی وجہ سے بہت سے سنیما ہال بند ہوجاتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے تک ہندوستانی فلمی بازار پر فرانس

حاوی تھا، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کا حصہ بہت کم تھا۔ مگر پہلی جنگ عظیم چھڑی تو فرانس، اٹلی اور جرمنی میں فلمیں بننا قریب قریب بند ہوگئیں۔ برطانیہ میں بھی کساد بازار کی وجہ سے کم ہی فلمیں بن پا رہی تھیں، مگر ناظرین ہر جگہ پہلے ہی کی طرح موجود تھے، اور ان کی فلموں کی پیاس بھی ویسی ہی تھی، اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکن فلم سازوں نے بڑے پیمانے پر پروڈکشن شروع کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران امریکہ نے ایک اور کام یہ کیا کہ فلم تقسیم کرنے کا طریقۂ کار متعین کر دیا، اسی زمانے میں چارلی چاپلین اور میری پگ فورڈ جیسے اداکار پیدا ہوئے جن کی وجہ سے امریکن فلموں کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہوتے ہوتے یعنی 1918 کے قریب ہالی ووڈ دنیا کا فلمی پایۂ تخت بن چکا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق 1925 میں پورے برطانوی اسکرین ٹائم کا 95 فیصد وقت امریکن فلموں کے قبضے میں تھا اور فرانس میں بھی یہی صورت حال تھی۔[1] 27-1926 میں ہندوستان میں بھی جو فلمیں ریلیز ہوتی تھیں ان میں صرف پندرہ فی صد ہندوستانی ہوتی تھیں 85 فیصد غیر ملکی وہ بھی زیادہ تر امریکن۔

اسی صورت حال میں ہندوستان میں متکلم فلموں کی ابتدا ہوئی اور 1931 میں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' تیار ہوئی۔ مگر متکلم فلموں کے ساتھ زبان کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ خاموش فلمیں پورے ہندوستان بلکہ برما، ملایا، سنگاپور اور سری لنکا کے لیے بھی ہوتی تھیں ان میں زبان کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ہندوستان مختلف لسانی اکائیوں میں بٹا ہوا ہے اور کوئی ایک زبان ایسی نہیں ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو، لہذا یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اب جس زبان میں بھی فلم بنے گی اس کے ناظر محدود ہو جائیں گے۔ پھر بھی متکلم فلمیں تیزی سے بنیں اور خوب کامیاب ہوئیں۔ ''عالم آرا'' جب پہلے پہل ممبئی کے ایک سنیما ہال میں دکھائی گئی تو مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے پولس کی مدد لینی پڑی اور چار آنے والے ٹکٹ چار روپے میں بلیک ہوئے دوسرے شہروں میں بھی یہی حال ہوا۔[2]

1931 میں بائیس فلمیں اردو میں، تین بنگالی میں، ایک ایک تلگو اور تامل میں بنیں۔ 1933 میں اردو میں پچھتر فلمیں بنیں اور دوسری زبانوں کی فلموں کی تعداد بھی بڑھی۔

ابتدائی دور کی تمام متکلم فلمیں تجارتی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ہوئیں۔ ان فلموں کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ پہلی چیز تو یہ کہ مادری زبان یا ایک ایسی زبان کے استعمال نے جو ان کی بول چال کی زبان تھی، عوام کو مسحور و مسرور کر دیا۔ اس سے ناظرین غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ غیر ملکی فلموں کی زبان کم لوگ سمجھ پاتے تھے۔ پھر ان کی تہذیب و معاشرت بھی مختلف ہوتی تھی اور نظریۂ زندگی بھی مختلف تھا۔ لہذا یہاں کا عام ناظر ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتا تھا۔ ہندوستانی فلموں کے منظر، ماحول، طرز، زندگی، رسم و رواج اور طور طریقے سے یہاں کا عام ناظر مانوس تھا پھر ان فلموں کی کہانیوں میں ان کی اپنی زندگی کی پرچھائیاں ہوتی تھیں جن میں وہ زیادہ کشش محسوس کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے مغربی فلمیں تکنیکی، فنی اور ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر رہی ہوں۔ مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ان میں زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔

اس وقت فلم ایک متحیر کر دینے والی چیز تھی۔ ابتدا میں تصویر جامد سے متحرک ہوئی تو یہی بہت بڑا عجوبہ تھا۔ لوگ صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے کہ ریل پردے پر کیسے دوڑ رہی ہے۔ جہاز کیسے اڑ رہا ہے متکلم فلموں کا دور شروع ہونے پر جب ریل سیٹی بجانے لگی، جہاز گھڑ گھڑانے لگا اور انسان ہنسنے رونے، چیخنے چلانے لگا تو تحیر و مسرت کی انتہا نہ رہی اور یہ ابتدائی ہندوستانی متکلم فلمیں اپنی فنی و تکنیکی کمزوریوں کے باوجود کامیاب رہیں۔

اس وقت موسیقی، رقص، شاعری اور اداکاری تھیٹر اور تھیٹر سے الگ بھی عوامی تفریح کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ ان چیزوں کو فلموں میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ یہاں رقص، موسیقی اور ڈراموں کی روایت ہزاروں سال سے موجود تھی اور لوگوں کے مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی۔ فلموں میں یہ روایت ایک نئی قوت اور زور کے ساتھ آگے

بڑھی اور یہاں کے ناظرین کو مسحور کر گئی۔

متکلم فلموں کے ابتدائی دور میں ہندوستانی فلمی صنعت کے ارتقا میں تین فلم کمپنیوں کا بہت اہم رول ہے۔ ان میں ایک ہے ''نیو تھیٹر لمیٹڈ'' جو ٹالی گنج کلکتہ میں 1930 میں قائم ہوئی۔ اسے قائم کرنے والے نریندر ناتھ سرکار تھے۔ اس کمپنی نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ نریندر ناتھ سرکار نے اپنی اس کمپنی کے لیے دیبکی بوس کی خدمات حاصل کیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کی فلم ''سیتا'' پہلی ہندوستانی فلم تھی جو وینس کے فم فیسٹیول میں دکھائی گئی۔ اس کمپنی سے پرنس بروا بھی وابستہ تھے۔ جنھوں نے شرد چند چٹرجی کے بنگلہ ناول پر منحصر فلم ''دیو داس'' پہلے بنگلہ پھر اردو میں اس طرح ڈائرکٹ کی کہ اردو سماجی فلموں کے نظریے میں انقلاب برپا ہوگیا۔

دوسری فلم کمپنی جس نے ابتدائی متکلم فلمیں بنائیں، پربھات فلم کمپنی تھی۔ یہ کمپنی 1929 میں کولہا پور میں وی. شانتا رام نے چار حصے داروں کی مدد سے قائم کی۔ 1936 میں وی. شانتا رام نے فلم ''امر جوتی'' بنائی جسے وینس فلم فیسٹیول میں دکھایا گیا۔ اس کمپنی نے 1936 میں ہی ''سنت تکا رام'' مراٹھی میں بنائی۔ جس کی ہدایت ایس. فتح لال نے دی تھی۔ جو اس کمپنی کے ایک حصے دار تھے۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم ہے جسے وینس فلم فیسٹیول میں ایوارڈ ملا۔

وی شانتا رام سماجی فلموں میں انوکھے پن، اور نئے نئے تجربات کے لیے جانے جاتے ہیں۔ دراصل اس وقت عوام کی مانگ (جس کا پتہ اخبارات اور فلم تقسیم کاروں کے ذریعے چلتا تھا) سماجی حقائق پر مبنی فلموں کی تھی۔ شانتا رام یہ مانگ پوری کر رہے تھے یہی ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔

تیسری فلم کمپنی کی بنا دیوکارانی اور ہمانشو رے نے ڈالی۔ یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک تھے۔ ہمانشو رے نے پہلے غیر ملکی فلم سازوں کے ساتھ مل کر فلمیں بنائیں، پھر ممبئی آگئے۔ یہاں ایک بڑا اسٹوڈیو بنوایا۔ جدید سے جدید تر آلات اور مشینیں حاصل کیں کچھ ٹکنیشین جرمنی سے لائے اور کچھ آرٹسٹ یہاں سے لے کر

ایک بڑی ٹیم بنائی اور نیو تھیٹر و پربھات کی طرح ''بامبے ٹاکی لمیٹڈ'' کے نام سے ہر ایک زاویے سے مکمل اور خود کفیل کمپنی قائم کی۔

ہمانشو رے اور دیو کارانی نے ایک ٹریننگ پروگرام شروع کیا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا انٹرویو کے ذریعے انتخاب کر کے انھیں ٹریننگ دینے لگے اور جلد ہی اس کمپنی کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے نام ہندوستان گیر شہرت حاصل کرنے لگے۔ ان نوجوان اداکاروں میں اشوک کمار، راج کپور، دلیپ کمار، ڈائرکٹر ایس مکرجی اور رائٹر کے .اے .عباس شامل تھے۔

متکلم فلموں کے ابتدائی دس برسوں میں علاقائی سرپرستی نے فلمی صنعت کو کافی متاثر کیا۔ اس سلسلے میں عموماً دو رجحانات ملتے ہیں۔ ایک تو مخصوص لسانی علاقے میں اپنا پروڈکشن سینٹر بنانا۔ مثلاً ابتدا میں مدراس میں ساؤنڈ پروڈکشن مشین یا اسٹوڈیو نہیں تھے۔ لہذا انھیں ممبئی اور کلکتے کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جب ممبئی اور کلکتے میں بنی تامل تیلگو فلموں کے پروڈیوسروں نے بھاری منافع حاصل کیا تو دکن میں جدید طرز کے اسٹوڈیو تعمیر ہونے لگے۔ ایسے اسٹوڈیو 36-1935 میں مدراس، سالم اور کوئمبتور میں بنے۔

دوسرا رجحان یہ تھا کہ لوگ تین بڑے سینٹروں سے ہی ملحق رہنا پسند کرتے تھے۔ یہ سینٹر اپنی علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی فلمیں بھی بناتے تھے۔ ممبئی کے مقابلے میں کلکتے میں یہ رواج زیادہ تھا وہ ایک سیٹ پر ایک ہی فلم کو دو زبانوں میں شوٹ کر لیتے تھے۔ گو کہ کاسٹ بدل جاتی تھی پھر بھی بہت سا خرچ بچ جاتا تھا۔ مثلاً ایک ہی رقص دونوں میں استعمال ہو جاتا تھا۔[3]

چوتھی دہائی کی ابتدا میں ممبئی کلکتہ اور مدراس میں بہت سی بڑی اور کامیاب فلمی کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں مگر ان کمپنیوں کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس دور میں فلم انڈسٹری سے متعلق لوگوں کی توجہ اس صنعت کو منظم کرنے کی طرف ہوئی۔ لہذا 1935 میں ''اے موشن پکچر سوسائٹی آف انڈیا'' قائم ہوئی۔ اس سے متاثر ہو کر علاقائی یا صوبائی سطح پر بھی تنظیمیں بنیں، ہر تنظیم اپنا ایک رسالہ یا خبر نامہ نکالتی تھی اور چوتھی دہائی

کے اختتام تک اس صنعت سے متعلق اڑسٹھ رسالے نکل رہے تھے جس میں آدھے انگریزی کے تھے بقیہ ہندوستانی زبانوں کے۔4

1930 تک ہندوستانی فلم صنعت میں سب سے زیادہ اہمیت پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی ہوتی تھی۔ اداکار صرف نوکر ہوتا تھا۔ زیادہ تر کمپنیوں کا اپنا اسٹوڈیو، اپنی لیباریٹریز اور اپنا عملہ ہوتا تھا۔ مگر 1940 میں ڈفنس ڈپارٹمنٹ کی نئی سرمایہ کاری کی وجہ سے نئے نئے پروڈیوسر میدان میں آگئے۔ ان کے پاس اپنا کوئی سازوسامان نہیں ہوتا تھا، وہ تمام چیزیں کرائے پر لیتے تھے۔ انھوں نے اداکاروں، گلوکاروں اور قلمکاروں سے ایک ایک فلم کے لیے معاہدہ کرنا شروع کیا۔ لہٰذا یہ تمام لوگ فلم کمپنیوں کی نوکریاں چھوڑکر آزاد پیشگی اختیار کرنے لگے۔ اور 1941 تک آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اچھے اداکار ایک ساتھ چار چار فلموں میں کام کرنے لگے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی گورنمنٹ نے جنگی پروپیگنڈے پر ڈاکومنٹری اور نیوز ریل بنوانا شروع کیا اور انھیں ہر سنیما گھر کے ہر شو میں دکھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے بھی فلم صنعت کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ جنگ کے دوران ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکٹنگ سے کچھ لوگوں کے پاس کافی ناجائز دولت اکٹھا ہوگئی تھی۔ اس کا استعمال دوسری جگہوں کی بہ نسبت فلم میں زیادہ آسان تھا۔ لہٰذا اس سے بھی فلم کے معیار اور ان کی تعداد پر مثبت اثرات پڑے۔

1947 کے بعد ہندوستانی فلم صنعت مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ کبھی ٹیکس کا بوجھ بڑھا، کبھی سنسر کا شکنجہ کسا، مگر اس وقت سے آج تک کوئی چیز اس کی ترقی کو نہیں روک سکی اور نہ ہی فلموں کی مقبولیت میں کوئی کمی آئی۔ آج بھی یہ عوامی تفریح کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔

حوالہ

1. Balcon E.T., Twenty Years of British Film, 1947, London, p.13.

2. Erikbarnvw, S. Krishnaswamy, Indian Film, New York, 1963, p.64

3. Ibid, p.100

4. Indian Cinematograph, Year Book, 1938, p.14.

پریم پال اشک

سنیما کو مقبول بنانے میں اردو کا کردار

سنیما اس دور کا مقبول ترین اور سب سے صحت مند ذریعہ اظہار ہے لیکن یوں تو سنیما کی کوئی زبان نہیں ہے لیکن اگر کوئی زبان ہے بھی تو صرف کیمرہ۔ اگر کسی فلم کی فلم بندی صحیح انداز سے کی گئی ہو، اس کے زاویے صحیح ہوں، شاٹ اور سین میں تسلسل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ایڈیٹنگ چست ہو تو فلم کی کہانی مکالموں کے بغیر بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

ہمارے خاموش دور کی فلموں اور بین الاقوامی فلمی میلوں کے دوران دکھائی جانے والی فلموں کی کامیاب نمائش اس کا مسلم ثبوت ہے۔ یہ فلمیں سب ٹائٹلز کے ساتھ بھی سمجھی جاتی رہی ہیں اور اگر ان کے بغیر بھی ان سے بخوبی حظ اٹھایا جاسکتا ہے۔ چارلی چیپلن کی فلمیں اس کا واحد ثبوت ہیں۔

اور اگر سنیما کی قوت گویائی عطا ہو جائے تو سونے پر سہاگے والی بات ہو جاتی ہے۔ اور سنیما اور ادب کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ سنیما کو مقبول بنانے میں کہانی، مکالمے اور نغمات کو اہمیت حاصل ہے۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے ہندستان میں سنیما کو مقبولیت کا تاج پہنانے میں اردو کا کردار اہم رہا ہے۔ اسے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1) کہانی (2) مکالمے (3) نغمات

دور کیوں جائیں ہمارے یہاں آج سے تقریباً 74 - 73 سال قبل جب ہندستانی سنیما نے خاموش دور کی زنجیریں توڑ کر متکلم عہد میں قدم رکھا اور ہماری اولین متکلم فلم 14 مارچ 1931 کو پردۂ سیمیں کی زینت بنی تو اس کے پیروں میں پائل سب سے پہلے اردو نے پہنائی اور عوام نے اس فلم کی تہ دل سے پذیرائی کی۔ فلم عالم آرا کے خالق ارڈشیر ایرانی تھے۔ اور فلم ساز ادارہ تھا امپیریل فلم کمپنی۔ یہ فلم اس دور کے ایک مشہور ڈرامہ نگار جوزف ڈیوڈ کے اردو ڈرامے عالم آرا پر مبنی تھی۔ اس کے مکالمے منشی ظہیر نے تحریر کئے تھے۔

ہماری یہ پہلی متکلم فلم عوام کے لیے ایک عجوبے سے کم نہ تھی۔ کیونکہ انھیں پہلی مرتبہ ناچتے گاتے، بولتے چالتے اور ہنستے روتے کردار رو پہلے پردے پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ لہذا عالم آرا جہاں ہماری اولین متکلم فلم تھی وہاں یہ ہماری پہلی اردو فلم بھی قرار دی گئی۔ لیکن آردیشر ایرانی نے اس فلم کے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ میری فلم نہ خالص اردو ہے نہ خالص ہندی یہ دونوں کی ملی جلی زبان ہے۔

اس کے ساتھ اس فلم نے ایک تاریخ ساز ریکارڈ بھی قائم کیا اور یہ متکلم عہد کی اولین باکس آفس ہٹ فلم بھی قرار دی گئی اس فلم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی شرح ٹکٹ خاموش فلموں کے دور میں دکھائی جانے والی فلموں کے مقابلے میں دوگنا کردی گئی یعنی دو آنے سے چار آنے۔ اور اس دور میں اس فلم کے ٹکٹ بلیک میں اس زمانے میں چار پانچ روپے میں فروخت ہوئے تھے۔

اس فلم کو سنسر بورڈ نے اردو ہندی سرٹی فیکٹ دیا تھا۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہماری پہلی اردو فلم تھی۔ برٹش حکمران اس دور کی فلموں کو عرف عام میں ہندستانی کہا کرتے تھے۔ دراصل عالم آرا کو ہندی فلم کہنا اپنی انا کو محض تقویت دینے کے مترادف ہے۔

یہاں اس امر کی جانب توجہ دلانی نہایت ضروری ہے کہ برٹش حکومت کے دوران بھی سنسر بورڈ کا اردو کے تئیں رویہ منافقانہ ہی رہا۔ اور حکام اردو فلموں کو اردو سرٹی فیکٹ جاری کرنے سے کتراتے رہے۔ اور اس کے بجائے وہ ہندستانی زبان کے نام پر فلم سرٹی فیکٹ جاری کرتے رہتے تھے۔ جبکہ ہندستانی زبان کے نام کی کوئی چیز یا کم از کم ہندستان میں تو ارتی نظر نہیں آتی تھی۔ درحقیقت عوام کو بے وقوف بنانے کی برٹش حکومت کی یہ ایک چال تھی۔ اس زمانے میں عوام کی زبان واضح طور پر ہندی تھی یا اردو۔ مشترک زبان یعنی ہندستانی تو صرف ایک بولی تھی، زبان نہیں۔ اس زمانے میں ہندی فلموں کی زبان عموماً اردو ہی ہوتی تھی کیونکہ فلم کمپنیوں کے مالکان اپنے یہاں اداکاروں کو اردو سکھانے کے لیے منشی مقرر کیا کرتے تھے۔

ہماری اس اولین اردو فلم نے مقبولیت کے جھنڈے بلند کردیے۔ اس فلم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یہ پہلی مرتبہ سات ہفتے ہاؤس فل چلی اور اسے چھ ماہ بعد پھر لگایا گیا۔ اس کے بعد اسے دوسرے شہروں میں بھی ریلیز کیا گیا۔ جب یہ فلم ممبئی کے میجسٹک سنیما میں پہلی مرتبہ ریلیز کی گئی تو ٹکٹ خریدنے والے ٹوٹ پڑے حتیٰ کہ مار پیٹ کی نوبت آگئی اور ہجوم پر کنٹرول کرنے کے لیے سنیما کے مالکان کو پولس تک کا سہارا لینا پڑا۔ تماشائی ٹکٹ خریدنے کے لیے بھاری تعداد میں یکجا ہوگئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اونچے درجے کے ٹکٹ ممبئی کے اپولو بندر جیسے دور دراز مقامات پر فروخت ہوئے تھے۔ آردیشر ایرانی نے فلم عالم آرا پر اس زمانے میں چالیس ہزار روپے صرف کئے تھے اور بیس لاکھ روپے کمائے تھے۔ اس سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ عوام کو دنیا کے اس آٹھویں عجوبے کو دیکھنے کا شوق تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں اردو کی مقبولیت کو بھی کافی حد تک دخل تھا۔

اردو کی کشش ہر کسی کو گرویدہ کرتی رہی ہے۔ آزادی سے قبل سہراب مودی نے اردو کی بقا کے لیے خاص طور پر جدوجہد کی۔ انھوں نے فلم خون کا خون عرف ہیلمٹ، پکار اور سکندر کے لیے اردو سرٹی فیکٹ حاصل کیے۔ اور محبوب خاں نے اپنی فلم

انہاں اور 1947 میں آنے والی فلم اعلان کے لیے اردو سرٹی فیکٹ لیے۔ جبکہ دوسری طرف کولکتہ میں نیو تھیٹرز کے مالک بی.این . سرکار نے کاروان حیات، یہودی کی لڑکی محبت کے آنسو اور زندہ لاش کے لیے اردو سرٹی فیکٹ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی۔

آزادی کے بعد نامساعد حالات کے باوجود سنسر بورڈ میں اردو کی شمع روشن رہی۔اس سلسلے میں سہراب مودی نے اپنی فلم مرزا غالب کے لیے اردو سرٹی فیکٹ حاصل کیا۔اور پھر کے آصف نے مغل اعظم، کے سی بوکاڈیہ لوانیڈ گاڈ عرف عشق اور خدا، کمال امروہی پاکیزہ، ستیہ جیت رے شطرنج کے کھلاڑی، اسمٰعیل مرچنٹ محافظ، سید مظفر علی امراؤ جان اور مہیش بھٹ سرداری بیگم کے لیے اردو سرٹی فیکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہاں اس امر کی جانب توجہ مبذول کرانی بھی ضروری ہے کہ مرزا غالب ہماری پہلی اردو فلم تھی جسے قومی فلمی اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔اس کے بعد شطرنج کے کھلاڑی، امراؤ جان، محافظ اور سرداری بیگم نامی اردو فلموں کا بہترین فلموں کے اعزاز سے نوازا گیا۔

تھیٹر اور سنیما کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ تھیٹر کے بغیر سنیما کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔فرق صرف اتنا ہے کہ تھیٹر میں زندہ کردار اسٹیج پر ناچتے گاتے اور روتے ہنستے نظر آتے ہیں اور تماشائیوں کا اداکاروں کے ساتھ براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ جبکہ سنیما صرف پرچھائیوں کا کھیل ہے۔

سنیما جب گھٹنوں گھٹنوں چل رہا تھا تبھی سے اسنے اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ متکلم سنیما پارسی تھیٹر کی دین ہے۔ جبکہ پارسی تھیٹر میں اردو کا چلن رہا ہے۔ اور اس طرح بنیادی طور پر سنیما کا اردو کے ساتھ ایک ازلی رشتہ قائم ہوگیا۔

آخر ہمارا سنیما اردو کی انگلی پکڑ کر ممبئی سے کولکتہ جا پہنچا۔ عالم آرا کی بے پناہ کامیابی سے کولکتہ میں مدن تھیٹرز کے مالک مختار جے. الیف مدن بے حد متاثر ہوئے

اورانھوں نے اسی انداز سے فلمیں بنانی شروع کر دیں۔ انھوں نے پہلے شیریں فرہاد بنائی ۔ اس کے بعد لیلیٰ مجنوں، شکنتلا اور پھر امانت کی اندر سبھا کو پردہ سیمیں کی زینت بنایا۔ شیریں فرہاد دیکھ کر تو لوگ دیوانے ہوگئے تھے۔ اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ ایک پنجابی تانگیوالے نے اپنا تانگہ گھوڑی گروی رکھ کر شیریں فرہاد اپنے کنبے کے ساتھ دیکھی اور اسنے خود یہ فلم 22 مرتبہ دیکھی تھی۔

فلم کی کہانی اس کی بنیاد تصور کی جاتی ہے۔اور اگر عمدہ اردو ناولوں ،افسانوں اورڈراموں پر مبنی فلمیں بنائی جائیں تو تماشائی یقیناً جوق در جوق سنیما گھر کا رخ کریں گے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے فلم ہٹ ہوجائے گی۔

تاریخ شاہد ہے کہ فلم شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور یہودی کی لڑکی جیسے ڈراموں کے علاوہ پریم چند کی کہانیوں اور ناول پر مبنی فلمیں گئودان، ہیرا موتی، غبن، عورت کی فطرت پر سوامی، پنچ پرمیشور پر پنچایت، شوکت تھانوی کے مشہور مزاحیہ ناول خدانخواستہ پر الٹی گنگا، منٹو کی کہانی پر مرزا غالب، عصمت چغتائی کے ناول ضدی پر ضدی، مرزا رسو کے شہرہ آفاق ناول امراؤ جان پر سید مظفر علی کی امراؤ جان ، غلام عباس کی کہانی آنندی پر مبنی منڈی، کرشن چندر کے ڈرامے ہمارا گھر پر ہمارا گھر اور کہانی ان داتا پر دھرتی کے لال ، ناول جب کھیت جاگے پر تیلگو فلم ماں بھومی، پریم چند کی کہانی کفن پر تیلگو فلم آکاوری کتھا، قاضی نذرالاسلام کی اردو کہانی سپیرا پر نیو تھیٹرز کی فلم سپیرا، راجندر سنگھ بیدی کی کہانیوں پر گرم کوٹ اور پھاگن، ڈرامے نقل مکانی پر دستک اورناولٹ '' ایک چادر میلی سی '' پر ایک چادر میلی سی،خواجہ احمد عباس کے ناول اور کہانیوں پر'' چار دل چار راہیں''،'' شہر کا سپنا''،'' آسمان محل'' اور'' انہونی''، گلشن نندہ کے ناولوں پر'' کاجل''،'' نیل کمل''،'' سہاگ رات''،'' شہنائی'' اور'' کھلونا'' کے علاوہ '' الف لیلیٰ'' کی داستانوں پر مشتمل'' حاتم طائی''،'' علی بابا چالیس چور''،'' الہ دین کا چراغ'' ، جیسی کامیاب اور باکس آفس ہٹ فلمیں بنا کر عوام کے دل لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اردو کی کشش سے کون متاثر نہیں ہوا۔ اس کی کشش اور آغا حشر کاشمیری کے مشہور ومعروف ڈرامے یہودی کی لڑکی کا جادو اس حد تک سر چڑھ کر بولا کہ اپنے زمانے کے ممتاز کیریکٹر ایکٹر نواب کاشمیری نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے اور اس ڈرامے کے بوڑھے کردار کو زیادہ جاندار بنانے کے لیے اپنے تمام دانت اکھڑوا دیے تھے۔ تاکہ پچیس سال کا یہ نوجوان ستر سال کا بزرگ نظر آئے۔ اسے کہتے ہیں سنیما کا جلوہ اور اردو کی کشش۔

سنیما کو تھیٹر کی قید وبند سے آزاد کرنے اور سنیما اور تھیٹر میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے وی شانتا رام، پی سی بروا، دیوکی بوس، آرسی بورال اور دلیپ کمار جیسے ہدایت کاروں اور فنکاروں کی خدمات کا تذکرہ سنیما کے مورخین جلی حروف ہی میں نہیں بلکہ زریں حروف میں کریں گے لیکن اس کے باوجود سہراب مودی اور چندر موہن کے مکالموں کی ادائیگی کا پائدار تھیٹر یکل انداز اور اس پر کمال امروہی کے دل لوٹنے والے مکالمے فلم پکار کو باکس آفس ہٹ بنانے میں پیش پیش رہے۔ اس زمانے میں عوام کو فلم پکار کے مکالمے از بر ہوگئے تھے اور گھر گھر یہی آواز سنائی دیتی تھی۔ ''فریادی! کس نے پکارا ہمیں۔'' اداکار چندر موہن اور سہراب مودی کے صرف مکالمے سننے کے لیے ہی تماشائیوں نے فلم پکار کو پچیس پچیس مرتبہ دیکھا تھا۔ فلم پکار سہراب مودی کی وہ لاجواب اور تاریخ ساز فلم تھی جس کے ذریعے ہماری فلموں میں شاہی القاب اور آداب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اسی کمال امروہی نے جب اپنی فلم رضیہ سلطان بنائی تو یہ ایک عمدہ فلم ہونے کے باوجود اوندھے منہ گر گئی۔ کیونکہ اس کے فارسی زدہ مکالمے عوام کے سر سے گزر کر رہ گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ عوام سیدھی سادھی بات کو سیدھے سادھے انداز سے سننا پسند کرتے ہیں۔

اس کے بعد سہراب مودی کی ایک اور لاجواب فلم سکندر آئی اس فلم نے پورے ملک میں ایسی دھوم مچائی کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ جس نے سکندر نہیں دیکھی اس نے فلم نہیں دیکھی۔ اس شہرہ آفاق فلم کی کہانی اور مکالمے پنڈت سدرشن کے زور قلم

کا نتیجہ تھے۔ اس کے مکالمے بھی انتہائی پر کشش تھے۔ پھر محبوب خان کی فلم روٹی آئی۔ اس کے دھماکے دار مکالمے وجاہت مرزا نے تحریر کیے تھے۔ اس فلم سے برٹش حکومت بوکھلا اٹھی اور اس پر پابندی عائد کر دی گئی اور اسے قید و بند کی صعوبت سے آزادی کے بعد ہی نجات ملی۔

اس کے بعد مکالمہ نگاری کی مقبولیت کا سورج موسیقی اور نغمات کے بادلوں میں چھپ تو ضرور گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرشار سیلانی، راجندر سنگھ بیدی اور آغا جانی کاشمیری اپنے تیکھے مکالموں کے تیر چلاتے رہے۔ پھر ارجن دیو رشک نے دل ایک مندر، جس دیش میں گنگا بہتی ہے اور اونچے لوگ جیسی سپر ہٹ فلموں کے مکالمے لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فلم پربھات کے مکالمے اتنے جاندار تحریر کیے تھے کہ سنسر بورڈ کو اس فلم کو دو مرتبہ سنسر کرنا پڑا تھا۔

یوں تو کچھ عرصہ تک پنڈت مکھ رام شرما مکالمہ کے میدان میں چھائے رہے لیکن ساتھ ساتھ شہرت اور مقبولیت اردو ادیبوں کے دروازے پر دستک دیتی رہی۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور اختر الایمان کے تیکھے اور دھار دار مکالموں کے ذریعہ اردو کی عظمت کا سکہ تماشائیوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد آئے سلیم اور جاوید۔ انھوں نے یورپین سنیما کی طرح باقاعدہ اپنا دفتر قائم کیا جس طرح ساحر نے اپنے دور میں فلمی دنیا کو ایک شاعر کی اہمیت کا احساس دلایا اسی طرح سلیم اور جاوید نے ایک ادیب کے وقار کو نصف النہار پر پہنچا دیا۔ انھوں نے شعلے، دیوار، زنجیر، سیتا اور گیتا اور ترشول جیسی فلموں کے مکالمے تحریر کر کے تماشائیوں سے صحیح معنی میں خراج تحسین حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گلزار جیسے ممتاز شاعر اور ادیب نے انگور، چپکے چپکے، ماچس اور ہوتو تو جیسی جاندار فلمیں لکھ کر عوام پر اردو کی گرفت اور مضبوط کر لی۔ اس طرح سنیما عوام کے اتنا قریب آ گیا کہ سنیما کو سماج کا ایک جزو تصور کیا جانے لگا۔

سلیم اور جاوید کی شہر آفاق فلم شعلے نے باکس آفس کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا

نے اب تک فلم دل والے دلہنیا لے جائیں گے کے سوا اور کوئی فلم نہ توڑ سکی۔ شعلے نے ممبئی کے ایک سنیما گھر میں مسلسل پانچ سال چل کر تماشائیوں کو اسیر کر لیا۔ شعلے کے گبر سنگھ کا جادو ایسا چلا کے گھر گھر اس کے مکالمے گونجنے لگے اور لوگوں نے ان مکالموں کی کامنٹری پر کتابیں تک لکھ ڈالیں اس میں جہاں سلیم اور جاوید کی محنت کو دخل تھا۔ وہاں اردو زبان کی کشش بھی پیش پیش تھی کہ جس نے سنیما کو عوام کی قبولیت کا شرف بخشا۔

شعلے کی کامیابی کے بعد ایک مرتبہ ممتاز فلم ساز ہدایت کار بی آر چوپڑا صاحب سلیم جاوید کے دفتر میں تشریف لائے اور انھیں اپنی ایک فلم کے لیے مکالمے تحریر کرنے کی پیش کش کی اور دس ہزار روپے کا چیک بطور پیشگی پیش کیا۔ مگر انھوں نے یہ رقم یہ کہہ کر لوٹا دی کہ ہم سے نئی فلم لکھوانے کے لیے آپ کو کم از کم دس سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔

فلموں میں ادب کی چاشنی پیدا کرنے میں اردو کے جن ادیبوں نے دن رات ایک کر دیا ان میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، آغا جانی کاشمیری، سرشار سیلانی، کمال امروہی، گلزار، ارجن دیو رشک، عصمت چغتائی، وجاہت مرزا، ابرار علوی اور ڈاکٹر راہی معصوم رضا پیش پیش رہے۔ ان کی اہم فلموں میں مرزا غالب، من چلی، وقت، آوارہ، پکار، محل، آندھی، دائرہ چپکے چپکے، دل ایک مندر، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، روٹی، مدھومتی، سنگھرش، منورنجن، صاحب بی بی اور غلام، گرم ہوا، سونے کی چڑیا اور جنون خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہمارے یہاں ہندی سنیما کی کامیابی کا انحصار بنیادی طور پر دلنشیں نغمات اور دلفریب موسیقی رہا ہے۔ اور اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ فلم خواہ عالم آرا ہو یا شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں ہو یا دیوداس، رتن، انمول گھڑی، میلا، ناگن، بیجو باورا، نیا دور، انارکلی، دل لگی، ٹیکسی ڈرائیور، تم سا نہیں دیکھا، جنگلی، ہم آپ کے ہیں کون یا دل والے دلہنیا لے جائیں گے ہمارے یہاں کی کوئی بھی فلم دیکھ لیجیے ان کی کامیابی کا سورج

موسیقی اورنغمات کے افق ہی سے طلوع ہوا ہے اوراس کا شرف اردو شعرا ہی کو حاصل ہوا اور آغا حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی، ڈی این مدھوک، قمر جلال آبادی، تنویر نقوی، راجا مہدی علی خاں، شکیل، ساحر، راجندر کرشن، مجروح سلطان پوری، حسرت جے پوری، کیفی اعظمی، گلزار، جاوید اختر اور آنند بخشی جیسے اردو شعراء ہٹ فلموں کے سرتاج رہے ہیں۔

دیہات میں آج بھی شادی بیاہ کے موقع پرلڑکی کی بدائی کے وقت فلم نیل کمل کا گیت ''بابل کی دعائیں لیتی جا'' ہی بجایا جاتا ہے یا پھر فلم سورج کا نغمہ ''بہارو پھول برساؤ'' سنا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہر قومی تقریب پرلاؤڈ اسپیکر پر پرانی فلم شہید کا ترانہ'' وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو''۔ اور فلم نیادور کا ہر دل عزیز گیت ''یہ دیش ہے ویر جوانوں کا'' سننے میں آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مندروں میں آج بھی مذہبی تقریب کے موقع پرفلم بیجو باورا، خاندان اورمس میری کے یہ روح پرور بھجن دلوں کوسکون بخشتے ہیں۔

''من تڑپت ہری درشن کوآج''

''بڑی دیر بھئی نندلالہ تیری راہ تکے برج بالا''

''بندرابن کا کرشن کنہیا سب کی آنکھوں کا تارا''

ان تمام نغمات کے خالق ساحر، حسرت جے پوری، راجا مہدی علی خاں، شکیل بدایونی اور راجندر کرشن تھے۔

جہاں تک کیفی اعظمی کا تعلق ہے انھوں نے فلمی شاعری کوایک اعلی اور ارفع مقام عطا کیا ہے ان کی خدمات کوقطعی طور پرفراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہماری پہلی منظوم فلم'' ہیررانجھا'' لکھ کر یہ ثابت کردیا کہ قلم کے تیشے سے ہیررانجھا جیسی منظوم فلم کی نہر اردو کے ذریعہ ہی لائی جاسکتی ہے۔اس میں مدن موہن کی موسیقی اور کیفی اعظمی کے نغمات نے سونے پرسہاگے کا کام کیا تھا۔

دوسری طرف جاوید اختر نے اپنی ذہانت کا بے مثل ثبوت دیتے ہوئے فلمی

نیا کے میدان میں ایک بار نہیں دو مرتبہ شب خون مارے۔ مکالمہ نگاری اور اسکرپٹ رائٹنگ کے میدان میں بھی اور شاعری کے میدان میں بھی فلم ''تیزاب'' اور ''مسٹر انڈیا'' سے لے کر ''بارڈر'' اور ''کل ہونا ہو'' تک وہ کامیاب اور سپر ہٹ فلموں کی صحیح معنی میں ضمانت رہے ہیں۔

جہاں تک گلزار کا تعلق ہے ان کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ فلم بندنی سے لے کر ہوتو تو انھوں نے جتنی بھی فلمیں کی ہیں ان سب میں بنگال اسکول تو جھلکتا نظر آتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی انفرادیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ کیا نغمات، کیا اسکرپٹ رائٹنگ اور مکالمے اور کیا ہدایت کاری کا انداز، یہ سب کچھ اپنی مثال آپ ہیں۔

اس حقیقت کو درگزر نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں مشرقی ہندستان میں اردو کو سنیما سے متعارف کرانے میں نیو تھیٹرز کے مالک مختار بی این سرکار اور مدن تھیٹرز کے مالک جے ایف مدن پیش پیش رہے ہیں وہاں جنوبی بھارت میں اردو کاڈنکا جیمنی پکچرز کے مالک مختار ایس ایس واسن اور اے وی ایم کے فلم ساز اور ہدایت کار ایم وی رمن کے دم سے بجا۔ انھوں نے ممبئی سے راجندر کرشن، راما نند ساگر، انوراج آنند، پنڈت سدرشن، شکیل اور ساحر یعنی اس دور کی اردو کی پوری کھیپ کو اپنے فلم رائٹنگ ڈپارٹمنٹ میں شامل کر کے چینئی بلا لیا اور ان سے اسکرپٹ رائٹنگ کرائی اور مکالمے بھی لکھوائے اور نغمات بھی اور پھر لطف یہ کہ دام بھی منہ مانگے دیے جنھوں نے منگلا، نشان، سنسار، انسانیت، پیغام، زندگی، بہت دن ہوئے، گھونگھٹ، مسٹر سمپت، لڑکی اور بہار جیسی لاتعداد جوبلی ہٹ فلمیں پیش کر کے سنیما کے سر پر مقبولیت کا تاج پہنایا۔

فلمی دنیا میں اسکرپٹ رائٹنگ مکالمہ نگاری اور شعری خدمات کے صلے میں اردو ادیبوں اور شاعروں کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ ہمارے جن فلمی شعراء اور ادبا کو ساہتیہ اکادمی، پدم شری، پدم بھوشن، اقبال سمان اور گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے ان میں کیفی اعظمی، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، شہریار،

ندا فاضلی ،سریندر پرکاش، علی سردار جعفری، جذبی، جوش ملیح آبادی، مجروح سلطان پوری، جاوید اختر اور گلزار شامل ہیں۔

آنند بخشی، مجروح، کیفی، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، جاوید اختر اور گلزار کو متعدد بار فلم فیئر ایوارڈز، زی ٹی وی ایوارڈ اور اسکرین ایوارڈ کے علاوہ کئی اور ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔

یہ امر قابل فخر اور مسرت ہے کہ مجروح اردو کے ہمارے واحد شاعر تھے جنھیں 1994 میں فلموں میں نغمہ نگاری کے لیے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اس کے علاوہ انھیں 1996 میں اسکرین کے لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

کوئی بھی فلم پبلسٹی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی اس کے لیے رسائل اور جرائد اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو صحافت نے بھی اس سلسلے میں کامیاب رول ادا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا چترا ویکلی کا یہ ہفت روزہ آزادی سے قبل لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس نے پورے پنجاب کے علاوہ دلی اور کشمیر کے ساتھ ساتھ ہندستان کے تمام ہندی نژاد علاقوں میں دھوم مچا رکھی تھی۔ آزادی کے بعد یہ جریدہ دلی سے شائع ہونے لگا اس کے ایڈیٹر دھرم ویر اور مالک وی پی پوری تھے۔ آزادی کے بعد یہ جریدہ پہلے ہفت روزہ پھر پندرہ روزہ اور اس کے بعد ماہنامہ شائع ہونے لگا۔ چترا کے علاوہ کئی اور فلمی رسائل اور جرائد بھی شائع ہوتے تھے مثلاً تیج پریس کا فلم آرٹ، شہزادہ تبسم عرف خوش باش کا لالہ زار، اسکرین، چترکار، اداکار، کلاکار یہ تمام ہفت روزہ تھے۔ ان کے علاوہ ماہنامہ نرالی دنیا، روبی، آریہ دوت، فلمی ستارے اور شمع کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ شمع تو فلم صحافت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس ادارے کی طرف سے فلم ایوارڈ عطا کیے جانے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا۔ اپنے زمانے میں ایک لاکھ کی اشاعت کا حامل یہ ماہنامہ ایک وقار کا حامل رہا۔

سنیما کو مقبول بنانے میں اخبارات نے بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ اس میں خواہ حیدرآباد کا رہنمائے دکن ہو، کلکتہ کا آزاد ہند ہو، ممبئی کا انقلاب ہو یا جالندھر کا ہند سماچار،

دلی کا روزنامہ تیج ہو یا پرتاپ، ملاپ، قومی آواز اور راشٹریہ سہارا۔ تمام اخبارات اور جرائد اپنے یہاں سنیما کے لیے ہفتہ میں ایک دو صفحات ضرور وقف کرتے رہے ہیں۔ اس میں فلموں پر تبصرے بھی شائع ہوتے رہے ہیں فلمی شخصیات پر مضامین بھی اور فلمی دنیا کی خبریں بھی۔ یہ سلسلہ آج بھی نہایت شدت کے ساتھ جاری ہے۔

ایک زمانہ تھا جب روزانہ پرتاپ نے بہترین فلمی مضامین پر انعامات دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اور روزنامہ تیج نے تو اپنے اخبار کے ذریعہ ایک فلم گوئرز ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی اس کے ملک بھر کے فلموں کے ہزاروں شیدائی ممبر بنے۔ اس کے اجلاس بھی باقاعدہ منعقد ہوتے رہے۔ اس ایسوسی ایشن کے سربارہ اپنے زمانے کے نامور صحافی بلونت رائے پریمی تھے۔ فلم صحافت کا معیار کیا تھا یہاں اس سے کوئی بحث نہیں بلکہ دیکھنا تو یہ ہے کہ انھوں نے سنیما کو مقبول بنانے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ مشہور جریدہ آجکل نے اپنا فلمی نمبر شائع کرکے ادب کے ساتھ فلم کے رشتے کو مستحکم کیا۔

اب ذرا ایک تلخ حقیقت پر توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر اردو کا کوئی فلمی شاعر، ادیب یا فلمی صحافی اس جہان فانی کو خیرباد کہہ جاتا ہے تو اس کا نعم البدل نظر نہیں آتا۔ مطلع بالکل صاف دکھائی دیتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر سنیما کو اردو کے ذریعہ مقبول کرنے کے لیے خوب سے خوب تر کی راہ پر چلتے رہنا ہے۔ تو اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک نئی نسل تیار کرنی ہوگی اور انھیں اسکرپٹ رائٹنگ اور مکالمہ نگاری کی کڑی تربیت دینی ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انھیں سنیما میں گہری دلچسپی بھی ہو اس کے لیے گہرے مشاہدے اور عمیق مطالعہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ تبھی عمدہ کہانیوں پر خوبصورت فلمیں پیش کی جاسکیں گی۔ اور تیکھے اور دھاردار مکالموں سے عوام محفوظ ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ روح پر نغمات بھی دلوں کو گرما سکیں گے۔

سنیما کو مقبول بنانے کے لیے اردو فلموں کی نئی نسل تیار کیے جانے کی بھی

ضرورت ہے یہ سوچ کر خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

اگر آج سے 20 سال بعد اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے آٹے میں نمک کے برابر بھی نظر نہ آئیں گے تو اردو بیچاری کا حشر کیا ہوگا۔ اب تو ضرورت عمل کی ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر اقبال ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انیس امروہوی

سنیما اور ہمارا معاشرہ
(منفی و مثبت اثرات)

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں فوٹوگرافی کی تکنیک میں نت نئے تجربے ہورہے تھے اور تصویر کو متحرک بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ کئی دوسرے ممالک میں پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو ابھارنے کی کوشش 1893 میں ہی کامیابی کی طرف گامزن ہوچکی تھی۔ اس زمانے میں ہندستان میں بھی اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں تمام صفحات پر ایک ہی جیسی تصویریں چھاپی گئیں، مگر ہر تصویر پہلی تصویر سے تھوڑی سے مختلف ہوتی تھی۔ جب اس کتاب کے صفحات کو تیزی سے الٹا جاتا تو ایسا لگتا جیسے کتاب میں چھپی تصویر متحرک ہو اٹھی ہے۔

ہندستان کے شہر بمبئی میں سب سے پہلے 1896 میں بیرونی ممالک سے چھوٹی چھوٹی متحرک خاموش فلموں کی آمد شروع ہوئی اور 17رجولائی 1896 کو لمونیئر برادرس نے بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں میجک لالٹین کے نام سے ایک چھوٹی سی خاموش فلم کی نمائش کی۔ بعد میں اس طرح کی کئی فلموں کو عوام نے اور تھیٹر کے مالکوں نے بہت پسند کیا۔

طویل فیچر فلموں کے سلسلے کو ہندستان میں شروع کرنے کا سہرا دادا صاحب پھالکے کو جاتا ہے۔انھوں نے لائف آف کرائسٹ نام کی ایک غیر ملکی فلم سے متاثر ہوکر بڑی جدوجہد سے فلم راجہ ہریش چند کو مکمل طور سے ہندستان میں تیار کیا اور 1913 میں اس خاموش فلم کی نمائش ہوئی۔اس فلم میں راجہ ہریش چند کی بیوی کا کردار ہوٹل میں کام کرنے والے ایک بیرے نے ادا کیا تھا۔اس طرح ہندستان میں خاموش فلموں کا سفر شروع ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی آواز کو فلم کے ساتھ قید کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔حالانکہ 1900 میں پہلی بار گرودیوار بندرناتھ ٹیگور نے گراموفون پر خود اپنی ہی آواز میں... ''بندے ماترم'' گانا ریکارڈ کرایا تھا۔مگر کئی برس بعد 1931 میں ہندستانی فلموں کو بھی بولنا آگیا اور فلمساز آرڈیشر ا ایرانی نے ہندستان کی پہلی متکلم فلم عالم آرا کی نمائش کی۔اس طرح ہندستان میں متکلم سنیما کا جو سفر 1931 میں شروع ہوا تھا،اس نے آج ہمہ جہت ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک بہت بڑی انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے۔آج ہندستان فلمی صنعت میں ہالی ووڈ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا مرکز ہے، اور ایک اندازے کے مطابق یہاں ایک برس میں تقریباً ایک ہزار سے بھی زائد فلمیں بنتی ہیں،جن میں بڑی تعداد ہندی یا ہندستانی زبان کی فلموں کی ہوتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب فلموں میں کام کرنا یا فلموں سے وابستگی رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہمارے ہندستانی معاشرے میں ایسے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، جو کسی بھی طور سے فلموں سے تعلق رکھتے ہوں۔بیسویں صدی کی اس عظیم ایجاد سے اس قدر نفرت یا بے تعلقی کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، بلکہ ہمارے معاشرے کا نظام اور اس کی اخلاقی قدریں ایسی ہی تھیں کہ ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ سنیما کو معیوب سمجھتا تھا۔1931 سے باقاعدہ مکالماتی سنیما کا آغاز ہوجانے سے اس طرف لوگوں کی توجہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور پھر جب رنگین فلموں کا دور شروع ہوا تو لوگوں میں اس فن سنیما گری کی طرف رجحان زیادہ ہی بڑھ گیا، اور آج یہ عالم ہے کہ فلمیں ہماری زندگی کا ایک ضروری حصہ بن گئی ہیں۔

آج سینما انسانی جذبات اور اس کی سوچ کا ایک زبردست ذریعہ بن چکا ہے۔ اپنے ابتدائی دور سے ہی سینما کے مختلف شعبوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جو یا تو باکمال تھے یا گہری سوچ رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اچھی فلمیں بنائیں بلکہ نئے عہد کے اس سب سے بڑے اور طاقتور میڈیا میں نت نئے تجربات کر کے اس فن کو آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ سینما ہمارے معاشرے کا آئینہ اور لازمی حصہ بن گیا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی بہترین عکاسی ہماری فلموں میں ہو رہی ہے، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مغربی طرز معاشرت کی نقل میں جو کچھ ہماری فلموں میں دکھایا جا رہا ہے، وہی سب کچھ ہمارے معاشرے میں بھی اپنی جڑیں گہری کرتا چلا جا رہا ہے۔ عریانی، تشدد، سیکس، بے راہ روی، رشتوں کی توڑ پھوڑ، کرپشن، سیاست کے نام پر غنڈہ گردی، بے ایمانیاں اور نت نئے گھوٹالے وغیرہ سب ہماری فلموں سے ہی ہمارے سماج میں آئے ہیں۔ حالانکہ کچھ فلمسازوں اور ہدایت کاروں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی فلموں میں وہی کچھ دکھاتے ہیں، جو سماج میں ہو رہا ہوتا ہے، اور جو عوام ہماری فلموں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ کب کس عوام نے جا کر کسی فلمساز یا ہدایت کار سے یہ کہا کہ ''تم اپنی فلم میں سیکس یا تشدد دکھاؤ، تبھی ہم سینما ہال میں جا کر تمھاری فلم دیکھیں گے۔'' میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے فلمساز اور ہدایت کار بامقصد اور صاف ستھرے موضوعات پر فلمیں بنا کر عوام کے سامنے پیش کریں تو عوام ان کی فلموں کو ہی پسند کریں گے۔ میری اس بات کی تصدیق کے لیے چند فلموں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہے۔ کمال امروہی کی فلم پاکیزہ، یا مظفر علی کی فلم امراؤ جان جن دنوں بن رہی تھیں تو کس فلم بین نے ان لوگوں سے جا کر کہا تھا کہ آپ اپنی فلموں میں تشدد یا سیکس دکھائیں گے، تبھی ہم آپ کی فلم دیکھنے جائیں گے۔ حالانکہ ان دونوں ہی فلموں نے ایسے دور میں بے پناہ کامیابی حاصل کی تھی جب ہندستان میں تشدد اور سیکس سے بھری فلموں کی بھرمار تھی۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ کس فلم بین نے سلیم جاوید سے فرمائش کی تھی کہ تشدد سے بھرپور فلم شعلے کی کہانی لکھئے۔ ہاں اتنا ضرور ہے

کہ ہماری فلموں کی منفی اثرات ہمارے معاشرے پر جس تیزی سے اور جتنے بڑے پیمانے پر مرتسم ہوئے ہیں، اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرح کی بہت سی فلمیں تجارتی نقطۂ نظر سے کافی کامیاب بھی رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان اپنی فطرت میں برائی کی طرف زیادہ جلدی راغب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنیما کے منفی پہلوؤں کو ہمارے معاشرے میں زیادہ کامیابی ملی۔

جن دنوں ہندستان میں سنیما بتدریج ترقی کی طرف گامزن تھا، اس وقت ہمارے ملک کا ماحول مختلف تھا۔ برٹش حکومت کا شکنجہ پوری طرح ہمارے معاشرے کو جکڑے ہوئے تھا اور آزادی کے متوالے اپنی تمام تر قوت کے ساتھ آزادی کی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اس زمانے میں ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ تھا ہندستان کی آزادی... اور اس سے جڑی ہوئی تھی ہماری قومی ایکتا۔ لہذا انگریزی حکومت کی مختلف قسم کی پابندیوں اور ظلم وستم کے باوجود کئی لوگوں نے ہمت کر کے تحریک آزادی کے موضوع پر فلمیں بنائیں۔ ان پر پابندی بھی لگی۔ کچھ لوگوں نے سیدھے طور پر تحریک آزادی کو موضوع نہ بنا کر قومی اتحاد، ہندو مسلم بھائی چارہ، اونچ نیچ، سماجی بھید بھاؤ اور کچھ تاریخی موضوعات کو اس طرح پیش کیا جس سے عوام میں اتحاد قائم ہو اور تحریک آزادی کا پیغام بھی لوگوں تک پہنچ جائے۔ لہذا 1922 میں برٹش حکومت نے پریس سنسر شپ قائم کیا اور فلموں کو بھی اس قانون کے تحت پابند کر دیا۔

فیچر فلم ایک ایسا میڈیم ہے جو دیکھنے والے کے مزاج، طبع اور اس کی نفسیات پر راہ راست اثر ڈالتا ہے اور اس کے اثرات کی گہرائی اور گیرائی کہاں تک ہے، اس کا دارومدار ہر انسان کی اپنی ذہنی اور دماغی کیفیت پر ہے، لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جس ملک اور جس خطے میں فلموں میں جیسے رجحانات کی عکاسی کی جائے گی، وہاں کے کلچر اور تہذیبی اقدار پر بھی ویسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ فلم جیسے ذریعۂ ابلاغ کا رول اس لحاظ سے دوسرے میڈیا سے زیادہ موثر اور ہمہ گیر ہے کہ یہ ڈھائی تین گھنٹے تک تماشائی کو مصروف رکھتا ہے اور ہمہ تن گوش اور ہمہ تن چشم ہوکر اپنے

بنائے ہوئے جال میں الجھائے رکھتا ہے۔

اس صورت حال کا انتہائی خطرناک پہلو یہ ہے کہ آج کل فلموں میں تشدد، مار کاٹ، قتل و غارت گری اور عریانیت کو نہ صرف کہانی کا موضوع بنایا جارہا ہے بلکہ اسی قسم کے جرائم کی وارداتوں کو فلم میں لمحہ بہ لمحہ اس انداز سے دکھایا جارہا ہے کہ کوئی بھی انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں تشدد اور عریانیت کے رجحانات افسوسناک حد تک تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ان رجحانات سے نوجوان طبقہ، بلکہ کم عمر طبقہ اس سے زیادہ سے زیادہ اثر لے رہا ہے اور اس طرح ان ممالک کی ثقافت اور تہذیب میں تشدد اور عریانی کا رجحان رچ بس رہا ہے۔ ہمارے یہاں بھی آزادی سے قبل بہت کم فلمساز تھے، مگر ان میں معاشرے کے لیے ایک ذمہ داری تھی، ایک جذبہ تھا کہ ہم ایسی فلمیں بنائیں جن میں اصلاح معاشرہ کے لیے کوئی پیغام ہونا چاہیے، چاہے ہماری فلم پر لگائی رقم ہی کیوں نہ ڈوب جائے۔ اب یہ کمٹ منٹ بدل گیا ہے۔ آج کا فلمساز صرف اپنا منافع دیکھتا ہے۔ چاہے معاشرے میں غلاظت کے ڈھیر ہی کیوں نہ لگ جائیں۔

ایک بین الاقوامی جائزے کے مطابق گذشتہ چالیس برس سے فیچر فلموں میں تشدد کے موضوع پر کہانیاں پیش کرنے کا رجحان مسلسل فروغ پذیر ہے اور اعداد و شمار ثابت کررہے ہیں کہ اس سے ثقافتی ڈھانچے کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس جائزے کے مطابق 72 رفیصد فلموں میں نقصان دہ حد تک تشدد آمیز عناصر شامل ہیں اور 52 رفیصد فلموں میں تشدد اور قتل و غارت گری جیسے بھیانک مرکزی موضوعات پیش کیے گئے ہیں اور خون خرابے اور لوٹ مار کے واقعات کی پوری وضاحت اور ہر پہلو سے عکاسی کی گئی ہے، وہ بھی اس طرح کہ فلم دیکھنے والے کو نہ صرف ایسی وارداتوں کے ارتکاب کی شہہ ملتی ہے بلکہ جرم کے ارتکاب میں پیش آنے والی جھجک بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس جائزے کے مطابق صرف امریکہ میں ہونے والے تشدد آمیز جرائم کی پچیس سے پچاس فیصد تک وارداتیں قتل وغارت گری اور مار دھاڑ کے موضوعات پر بننے والی فیچر فلموں اور ٹیلی ویژن پروگراموں کی نمائش کے نتیجے میں ہو رہی ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندستان میں کئی بڑی وارداتوں کے مجرموں نے اس بات کا اقبالی بیان دیا ہے کہ انھوں نے فلاں جرم کی ترغیب فلاں فلم سے حاصل کی تھی۔ ایک نوجوان نے فلم ''انکار'' دیکھ کر ہی اغوا اور قتل کی واردات کی تھی اور پکڑے جانے پر اس ملزم کے وکیل نے کہا وہ کہہ دے کہ اسے یہ سب کرنے کی ترغیب فلم ''انکار'' دیکھ کر ملی تھی، تب اس کا جرم کم مانا جائے گا... اور اس طرح اس پر کسی باہری طاقت کا اثر مانا گیا جس کے غیر شعوری دباؤ میں آکر اس نے یہ جرم کیا، اور وہ مقدمہ جیت گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے پر سنیما کے منفی اثرات زیادہ گہرائی تک اپنا اثر قائم کرتے چلے گئے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ سماج نے سنیما کے مثبت پہلوؤں کو یکسر ہی نظر انداز کر دیا ہو۔

ہندستان کی آزادی کے بعد 55/ برسوں میں ہماری فلمی صنعت مخصوص کلچر سے جڑی ہونے اور اپنے وسائل پر انحصار کرنے کی وجہ سے کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی رہی ہے۔ 1950 کے بعد ہمارے سماجی اور ثقافتی ڈھانچے کی پیچیدگی، روایات، ذات پات، نسل اور مذہب، عصری جدید طاقتوں کے ٹکراؤ اور بدلتی ہوئی شہری اور درمیانہ طبقے کی قدروں اور رویوں کا ہمارے سنیما میں بڑی حد تک عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت کے فلمساز وہدایت کار معاشرے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچویں، چھٹی دہائی تک اور کسی حد تک ساتویں دہائی کے نصف تک ہمارے سنیما نے سماج کو بہترین فلمیں پیش کی ہیں۔ بمبئی میں سہراب مودی، وی شانتا رام، محبوب خان، بمل رائے، کمال امروہوی، خواجہ احمد عباس، گرودت، بی آر چوپڑہ اور یش چوپڑہ وغیرہ نے معاشرے کو تہذیب وثقافت سے بجی ہوئی اور غریبی اور استحصال پسند سماجی نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرتی ہوئی فلمیں پیش کیں، وہیں کلکتہ میں نیو تھیٹرز نے پی سی بروا کی دیوداس جیسی بہت سی کلاسیکل فلمیں تیار کیں۔ ستیہ جیت رے نے پاتھیر

پانچالی، اپراجیتو اور اپور سنسار جیسی فلموں کے ذریعہ فلمساز کا ایک الگ روپ پیش کیا۔ ستیہ جیت رے نے سنیما کو ایک نئی تعمیری جہت دی اور مرنال سین کے ساتھ مل کر متوازی سنیما کی داغ بیل ڈالی۔ ادھر بامبے ٹاکیز، پربھات کمپنی، محبوب اسٹوڈیو اور دیگر اسٹوڈیوز کی تیار کردہ فلموں کی بنیاد پر فلم سازی کی ایک نئی تاریخ رقم ہوئی۔ خواجہ احمد عباس نے، جو انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن سے گہری وابستگی رکھتے تھے، تن تنہا یا دوسروں کے اشتراک سے سماجی اہمیت کی حامل کئی فلمیں تیار کیں۔ ان فلموں میں سماجی پیغامات واضح تھے اور سماج کے مختلف طبقات کے مابین فرق کو اجاگر کیا گیا تھا۔ بمل رائے نے بھی ہندستان کے حالات پر حقیقت پسندانہ فلمیں تیار کیں۔ فلم دو بیگھہ زمین، جس میں ہندستانی کسانوں کی حالت زار پیش کی گئی تھی، بلراج ساہنی نے اس فلم کے ہیرو کے رول میں اپنی شاندار اداکاری کے ذریعہ اسے جدید کلاسک کی صف میں شامل کردیا تھا۔ ہندستانی سنیما کو نئی جہت بخشنے والے اس عہد کے فلمساز گرودت نے فلم پیاسہ اور کاغذ کے پھول جیسی فلموں میں رومانیت، المیہ اور شاعری کا حسین امتزاج پیدا کرکے معاشرے پر مثبت اثرات قائم کرنے میں بہترین کردار ادا کیا ہے۔ اسی دوران محبوب خان کی فلم مدر انڈیا نے ہندستانی سنیما کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ایک نئے ہندستان کی تعمیر کی سوچ معاشرے کو دی، جس میں نہ صرف جدید تکنالوجی کو اپنانے کی بات کہی گئی ہے بلکہ کسانوں کے تعلق سے ایک نئے نظام کی آمد کی نوید بھی سنائی دیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 70 کی دہائی تک بامقصد سنیما کے مثبت اثرات ہمارے سماج پر بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ہندستانی فلموں نے ہر دور میں قومی مسائل کی عکاسی کی ہے حالانکہ کچھ لوگ فلموں کو مکمل طور پر تفریح کا ایک ذریعہ ہی مانتے ہیں، لیکن گذشتہ صدی کی نویں دہائی تک یہی ایک سب سے بہتر، موثر اور مضبوط ذریعہ تھا، عوام تک اپنی بات پہنچانے کا... حالانکہ آج حالات مختلف ہیں۔ فاصلہ نما (ٹیلی ویژن) پر بے شمار چینل ہیں اور پوری دنیا میں انٹرنیٹ کا جال بھی پھیل چکا ہے۔ اس سب کے باوجود بڑے پیمانے پر ہمارے

عصری مسائل کی عکاسی آج بھی سنیما کے ذریعہ ہی ہو رہی ہے اور ہمارے معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات سنیما کے ذریعہ ہی مرتب ہو رہے ہیں۔ آج کی فلموں کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ فلم سے کہانی غائب ہوگئی ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں معیاری ادب کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ جس پر معیاری فلموں کے اسکرپٹ لکھے جا سکتے ہیں اور یادگار فلمیں بنائی جا سکتی ہیں۔ جس طرح پانچویں اور چھٹی دہائی میں رویندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر چٹرجی، منشی پریم چند، آر کے نارائن کی بہترین تخلیقات پر فلمیں بنائی گئیں۔ کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی نے اپنے زمانے کے معاشرے کے مطابق کئی بہترین کہانیاں فلموں کو دیں اور ان فلموں کے اچھے اثرات بھی معاشرے میں دکھائی دیے۔

آزادی کے بعد ہمارے سماج کا سب سے بڑا مسئلہ تھا قومی ایکتا، اتحاد اور معاشرے میں آ رہی نئی تبدیلیوں کا نئی نسل سے تعلق۔ لہٰذا وقت کی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہوئے اس وقت کے فلمسازوں نے ان موضوعات پر بہترین فلمیں بنائیں جو نہ صرف تجارتی نقطۂ نظر سے کامیاب رہیں، بلکہ ہمارے معاشرے پر بھی ان فلموں نے مثبت اثرات قائم کیے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں ایک تو اس زمانے میں کہانی پر زیادہ محنت کی جاتی تھی۔ اداکار بھی ایک وقت میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو۔ تین فلموں میں ہی کام کرتے تھے اور اپنے کردار کو بخوبی سمجھ کر ہی ادا کرتے تھے۔ دوسرے فلموں میں ہماری تہذیب، ثقافت اور ہمارے کلچر کو پیش کرنے کا بھی خاص اہتمام ہوا کرتا تھا۔ جہاں پہلے کے فلمسازوں نے اپنی فلموں کی زبان میں شائستگی کا خاص خیال رکھا ہے وہیں آج کے بیشتر گھٹیا درجے کی زبان استعمال کر رہے ہیں بلکہ قادر خان جیسے مکالمہ نگاروں نے تو ذو معنی الفاظ و مکالموں کی بھرمار سے فلموں کو اتنا زیادہ غیر معیاری بنا دیا ہے کہ پورے معاشرے پر اس کے بے حد منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

اردو زبان کے تعلق سے ہندستانی سنیما نے ہمارے معاشرے پر کافی مثبت اثرات مرتب کیے ہیں۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ جہاں دلوں کی تقسیم ہوئی، وہیں اردو کو

ایک سازش کے تحت صرف مسلمانوں کی زبان کہا گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے خلاف سازشوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور ایسی فلموں کو ہندی فلم کا سرٹیفکٹ دیا جانے لگا جن کی زبان اردو ہوتی تھی۔ مظفر علی کی فلم امراؤ جان کو بھی ہندی فلم کا سرٹیفکٹ عطا کیا گیا، جب کہ یہ فلم مرزا رسوا کے اردو کے تقریباً پہلے مکمل سماجی ناول امراؤ جان ادا کی کہانی پر مبنی تھی۔ اگر سنیما کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو جذبات کی عکاسی، کردار کی پختگی، مکالموں کا جادو، فلمی نغموں کا سرور جو ہمارے معاشرے کے سر چڑھ کر بولتا ہے، اس کی وجہ صرف اردو زبان ہی ہے۔ ہماری تاریخ ساز کامیاب فلمیں مغل اعظم، انارکلی، مرزا غالب، تاج محل، جنون، شطرنج کے کھلاڑی، غزل، لیلیٰ مجنوں، چودھویں کا چاند، نورجہاں، رضیہ سلطان، پاکیزہ، میرے محبوب، جہاں آرا، صاحب بیوی اور غلام، بازار اور میرے حضور وغیرہ سینکڑوں فلموں کی زبان اردو ہی ہے۔ ان تمام فلموں کے بے شمار نغمے، غزلیں اور قوالیاں آج بھی عوام وخواص میں بے حد مقبول ہیں۔ اسی طرح کئی فلموں کے مکالمے جو ہمارے معاشرے میں زبان زد خاص وعام ہوئے، وہ بھی اردو کے ہی مکالمے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہمارے ہندستانی معاشرے میں جو زبان اردو یا ہندستانی کے نام سے استعمال ہورہی ہے اس کو بنائے رکھنے میں ہماری فلموں کا بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ مگر افسوس اسی بات کا ہے کہ اس کا تمام کریڈٹ ہندی زبان کو چلا جاتا ہے۔ آج تمام تر فلمساز اپنے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی فلموں کے سرٹیفکٹ ہندی زبان کے بنواتے ہیں، جب کہ ان فلموں کی زبان، ان کے مکالمے، اور نغمے سب اردو میں ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو کے کھاتے میں اتنی فلمیں بھی نہیں آتیں جتنی کسی ایک صوبائی زبان کے کھاتے میں آجاتی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی معیاری فلم جیسے محافظ یا نسیم بن بھی جاتی ہے تو وہ اتنے ناظرین اکٹھے نہیں کرپاتی جتنے کوئی دوسری اول جلول فلم آسانی سے جمع کرلیتی ہے۔ شاید اسی لیے آج کا فلمساز سستی تفریح کے نام سے نہ صرف عام ناظرین کو بیوقوف بنا کر لوٹ رہا ہے بلکہ معاشرے میں غلاظت بھی پھیلا رہا ہے۔

70ء کی دہائی میں ہماری فلموں کی ترجیحات میں تبدیلی رونما ہوئی اور جرائم پر مبنی موضوعات کو نہایت تزک بھڑک اور گلیمر کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔ تشدد اور عریانیت کی راہ پر ہماری فلمیں گامزن ہوگئیں۔ کہاں تو فلمسازی کے آغاز میں اول تو خواتین فلموں میں کام کرنے سے ہی گریز کرتی تھیں، لہذا مردوں کو عورتوں کا گیٹ اپ اور میک اپ دے کر کام چلایا جاتا تھا، پھر طوائفوں کو بھی موقع دیا گیا۔ مگر یہ طوائفیں زمیندارانہ نظام کی دین تھیں، تہذیب سے واقف تھیں اور ان کی فلموں میں کوئی غیر مہذب منظر نہیں ہوتا تھا۔ مگر بعد میں جو نئی کھیپ ہیروئینوں کی فلموں میں آئی، وہ زیادہ تر مہذب گھرانوں سے تھیں مگر انھوں نے دولت کمانے اور گلیمرس دکھائی دینے کی خواہش میں کسی بھی حد تک جانا منظور کرلیا۔ حالانکہ فلموں میں فحاشی اور عریانی کا الزام صرف ہیروئینوں کو ہی نہیں دیا جاسکتا، اس لیے کہ اس کے ذمہ دار فلم ساز وہدایت کار اورڈسٹری بیوٹرز وغیرہ بھی اتنے ہی ہیں، اور وہ فلم بین طبقہ بھی جو ان فلموں کو بڑی تعداد میں دیکھ کر ان کی سرپرستی کرتا ہے اور وہ بھی جو ایسی فلموں کو سخت ناپسند کرتے ہیں، مگر ان کے خلاف کبھی آواز نہیں اٹھاتے ہیں۔ لہذا عریانی اور تشدد کے ساتھ ہی ہماری فلموں کا موضوع جرائم پر مبنی کہانیوں کے اطراف میں طواف کرنے لگا۔ فلم شعلے کی بے پناہ کامیابی نے اس پر اپنی مہر لگادی اور پھر دیوار، ڈان، شان، پرندہ، انگارے، دھرماتما، اپرادھ، آپا تکال، ہتھیار، اور تازہ ترین فلموں میں منا بھائی ایم بی بی ایس جیسی فلموں کی ایک لمبی لائن ہے، جنھوں نے نہ صرف ہمارے معاشرے سے بے حد دولت کمائی بلکہ ایک مہذب سماج کو تشدد، عریانی اور جرائم کے الاؤ میں بھی جھونک دیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تکنیکی سطح پر ہمارے سنیما نے جتنی ترقی کی ہے، معیاری سنیما اس سے کہیں زیادہ پیچھے چلا گیا ہے اور ہمارے معاشرے پر اس، سب سے طاقتور میڈیا کی منفی اثرات غالب آتے جارہے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری نئی نسل کے فلمساز اور ہدایت کار معیاری ادب کا مطالعہ کرکے اپنی فلموں کے موضوعات طے کریں اور معاشرے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو دل سے محسوس کریں۔

ڈاکٹر قاسم خورشید

ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے تصور کو ترسیل کے کسی بھی کینوس پر شاید ہی مکمل طور پر پیش کر پاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے اور یہی تشنگی تادم حیات ایک جستجو بن کر اس کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ ہم خوابوں میں جینے والے لوگ بس تصورات کی پرچھائیوں سے خوش ہولیا کرتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ترسیل کے کسی بھی شعبے میں اعتماد حاصل کرنے والا شخص عموماً اپنے تصور کو کوئی پیرہن عطا کرنے میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت نظم ہوسکتی ہے، دلچسپ کہانی، پینٹنگ، موسیقی، ناول، ڈرامہ یا کچھ اور۔ آپ نے اکثر یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ ترسیل کے لیے جس صنف کا استعمال کیا گیا وہ آپ کے خیال کو مکمل طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ یا پھر ایسا ہوا ہوگا کہ آپ جو کہنا چاہ رہے ہونگے آپ کا قاری، سامع یا ناظر اس سے بہت کم یا زیادہ سمجھ پایا ہوگا۔ ایسا تو عموماً ہوا ہے کہ تخلیق سے زیادہ اس پر کیے گئے تبصروں کو لوگوں نے پسند کیا ہے۔ یا پھر بعض فن پارہ اپنی بے پناہ شدتوں اور تخلیقیت کے باوجود

موضوع بحث بن نہیں پایا۔

یہ دور دراصل عوامی ترسیل کا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے فکری میلانات، فلسفیانہ جستجو، بلند اقدار، تہذیبی عوامل شدت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی فکر واضح ہے تو لفظوں کے بغیر بھی موقف کو سمجھنے میں دشواری درپیش نہیں آتی ہے۔

ٹیلی ویژن زندہ قوموں کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ یہ تفریح کا ایک خوبصورت میڈیم ہے بلکہ اس سے الگ بھی بہت کچھ ہے۔ آپ کے ہاتھ میں رموٹ ہے۔ مختلف چینل ہیں اور ایک دنیا آپ کے کمرے میں سمٹ آئی ہے ایسا بھی کچھ ضرور ہوتا ہے جس پر زیادہ تر افراد کی نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ آپ اگر تحقیق کریں گے تو مجموعی تاثر بھی ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ آخر ایسا کیا کچھ ہو رہا ہوتا ہے کہ آپ لمحے بھر کے لیے بھی اس چینل کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ ٹیلی ویژن یک طرفہ میڈیم ہے اور اگر ایسے میں یہ دیر تک آپ کو روک لیتا ہے تو کہیں کوئی بات ضرور ہوتی ہے جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے پروگراموں میں زیادہ تر اسکرپٹ پر مبنی سیریل یا ٹیلی پلے وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

یک طرفہ میڈیم ہونے کی وجہ سے ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری بہت اہم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہمیں بعض نکات پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم بتدریج یوں لائحہ عمل طے کریں تو بہتر اسکرپٹ نگاری کے لیے راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ جیسے:

- **اپنے ناظرین کو سمجھیں** :— کوئی بھی اسکرپٹ لکھنے سے پہلے آپ کو طے کرنا چاہیے کہ کس کے لیے یہ کام کیا جانا ہے۔ اگر آپ نے اپنے ناظرین کے بارے میں جان لیا تو پھر آسان ہو جاتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ بچے شہر کے ہو سکتے ہیں گاؤں کے بھی۔ خواندہ ہو سکتے ہیں ناخواندہ بھی۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے رہن سہن ان کی لیاقت، سماجی اور سیاسی فکر

وغیرہ کو پرکھ لینا ضروری ہے۔

- **موضوع کا انتخاب** :— اب آپ اپنے لیے کسی موضوع کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ ہر موضوع ایک وسعت لیے ہوا کرتا ہے لیکن آپ کو طے کرنا ہوگا کہ اپنے ناظرین کے لیے جس موضوع کا انتخاب کر رہے ہیں وہ کس حد تک اہم ہے۔

- **خصوصی مقصد** :— موضوع کا انتخاب کرتے وقت ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کس پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔ ظاہر ہے کوئی ایک یا دو مقصد تو طے کرنے ہی ہونگے تا کہ آگے کام کرنے میں آسانی ہو۔

- **موضوع پر تحقیق** :— چاہے آپ نے کسی بھی موضوع کا انتخاب کیا ہو۔اس پر تحقیق بہر حال ضروری ہے تا کہ دلائل اور حقائق کی روشنی میں آپ کی اسکرپٹ معتبر کہی جا سکے۔ موضوع پر تحقیق کے فقدان سے تنازعے بھی ابھر سکتے ہیں اور بہتر تحقیق سے پروگرام کا معیار بلند ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اسکرپٹ نگار زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

- **مواد کی ترتیب** :— ناظرین کو پیش نظر رکھ کر جو مقصد طے کیا گیا اس کے تحت تحقیق بھی ہوئی مگر اس دوران ڈھیر سارے مواد حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہاں اپنی ضرورت کے تحت یکجا کیے گیے مواد کو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جو زائد ہوں انھیں نکال بھی سکتے ہیں۔

- **فارمیٹ/ صنف کا انتخاب** :— مواد کی ترتیب کے بعد اب اس کی پیش کش کے لیے فارمیٹ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ بھی ہو سکتا ہے فیچر، ڈوکیومنٹری یا ان سب کی آمیزش سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے تخلیق کا اصل مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

- **پروگرام ڈائرکٹر سے تبادلۂ خیال** :— چونکہ اسکرپٹ کو ویژولائز کرنے کا ذمہ ڈائرکٹر کا ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسکرپٹ کے عمل میں ہی تبادلۂ

خیال کے بعد خاص نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اسکرپٹ پڑھنے میں بہت دلچسپ ہوتی ہے لیکن پروڈکشن کے وقت اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسکرپٹ رائٹر اور پروگرام ڈائرکٹر ہر پہلو پر مطمئن ہو جائیں تو اسکرپٹ تیار کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

- **اسکرپٹ کا پہلا ڈرافٹ** :— پروگرام کے ڈائرکٹر سے تبادلۂ خیال کے بعد اسکرپٹ کا پہلا ڈرافٹ تیار کیا جائے۔ ظاہر ہے اسے تیار کرتے وقت طے شدہ ناظرین، خصوصی مقصد، مواد کی ترتیب و تحقیق ،فارمیٹ کا انتخاب اور پروگرام ڈائرکٹر سے تبادلۂ خیال کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہاں تخلیق کار کا وہ عمل شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی اسکرپٹ کو تخلیقی وسعت عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- **ڈرافٹ اسکرپٹ پر تبادلۂ خیال** :— اسکرپٹ تیار کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ پروگرام ڈائرکٹر کے علاوہ ممکن ہو تو اپنے بعض ناظرین کی موجودگی میں اسے پیش کیا جائے اور پھر مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہو۔ ممکن ہے بعض ایسے مشورے سامنے آجائیں جنھیں شامل کرنے کے بعد اسکرپٹ مزید بہتر ہو جائے۔
- **فائنل اسکرپٹ** :— اس مقام پر پہنچنے کے بعد اسکرپٹ پروڈکشن کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے تخلیق کار ہر عمل سے گذر چکا ہوتا ہے۔ اب وہ فائنل اسکرپٹ تیار کرتا ہے۔

یہاں بہتر اسکرپٹ کی بعض خوبیوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جیسے:

- شروعات دلچسپ ہو
- تصور واضح ہو
- مواد مقصد پر مبنی ہو
- واقفیت سے ناواقفیت کا لائحہ عمل ہو
- واضح طور پر ناظرین تک رسائی کی زبان ہو

- شدت تجسس ہو
- دلچسپ پیش کش ہو

ہم واقف ہیں کہ ٹیلی ویژن تصویری ذریعہ ابلاغ ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مکالمے غیر اہم ہیں۔ عام طور پر شروعاتی دور میں ٹیلی ویژن کے لیے جو کچھ لکھا گیا ان میں لفظوں کا زیادہ عمل ودخل رہا ہے۔ ہم پرنٹ میڈیم سے آواز کی دنیا اور پھر بولتی تصویروں تک پہنچے۔ ریڈیو کے لیے لکھا گیا تو اس پر کہیں نہ کہیں کتابی زبان اور اس کی مخصوص پیش کش کے اثرات بھی ہم نے قبول کیے۔ پھر دھیرے دھیرے موسیقی اور دوسرے ذرائع نے حسب ضرورت ریڈیائی پیش کش کو دلچسپ بنایا۔ ظاہر ہے لفظ کم ہونے کے ساتھ سہل بھی ہوئے اور کامیاب تخلیقی تجربے ہونے لگے۔ آج بھی ہمارے ملک میں ریڈیو کی ریٹنگ سب سے زیادہ ہے یعنی آواز کا جادو کم نہیں ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے والے زیادہ تر افراد یا ریڈیو سے تکنیکی طور پر واقف ہیں یا مخصوص ماڈل کو پیش نظر رکھ کر لکھنے کی کوششیں کررہے ہیں۔ ایسے میں اکثر یہی ہوا ہے کہ بھلے ہی ٹیلی ویژن پر بہ ظاہر کچھ پیش کیا جارہا ہے لیکن آنکھیں بند کرلی جائیں اور مکالمے گفتگو یا کمنٹری سن لیں تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں بنیادی فرق نظر نہیں آئے گا۔ آج بھی کئی ایسے سیریل مقبول ہیں جو دوردرشن پر شہرت حاصل کرنے کے بعد انھیں محض آواز والے حصے کو پیش کرکے ریڈیو کے ذریعہ سنایا جارہا ہے۔

ذرا سوچیں! ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اگر الفاظ حاوی ہوجائیں گے تو ایسے پروگراموں کو ہم ٹیلی ویژن کے نقطۂ نگاہ سے کامیاب تو نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ ویژوئل کا میڈیم ہے۔ یعنی ہماری سوچ پر تصویریں حاوی ہوں۔ تصویریں آپس میں مل کر معنویت پیدا کریں۔ اس لیے ٹیلی ویژن کی تکنیکی اسکرپٹ زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اسے کیمرے کی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہوگی۔ اس عمل میں پروگرام کا ڈائرکٹر بھی شامل ہوگا کیونکہ ہر سین ہر شاٹ اسے اسکرپٹ کے مطابق طے کرنا ہے۔ عموماً ایک سہل طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ یعنی سین، شوٹنگ کی جگہ اور وقت کے

تحت ہم ایک لمبے کاغذ پر کچھ یوں خاکہ بنا سکتے ہیں۔

منظر نامہ/اسکرین پلے۔ مکالمے/کمنٹری۔ موسیقی/دوسرے تاثرات

منظر نامہ/اسکرین پلے کے کالم میں بتدریج کی تفصیلات درج کر سکتے ہیں۔ جیسے ایک کمرہ کا منظر ہے۔ صوفہ ''گلدان، پرانے طرز کی پینٹنگ کے ساتھ کونے میں ایک گراموفون ہے اور دیوار پر گرد آلود گھڑی ٹک ٹک کر رہی ہے۔ ایک شخص جس کی عمر 70 سال ہے، پینٹنگ کو دیکھ کر خاصا مضمحل ہے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے گھڑی کی طرف بڑھتا ہے۔ اپنے کانپتے ہاتھوں سے کسی طرح گھڑی کو اتار لیتا ہے۔ پھر اپنے دامن سے صاف کرتے ہوئے وہ گھڑی سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

یہ ایک منظر ہے جس میں اب تک کوئی مکالمہ نہیں آیا۔ ویژول خود بتا رہے ہیں کہ اسکرین پر کیا کچھ ہو رہا ہے لیکن اب کردار کو کچھ بولنا ہے۔ یعنی اب مکالمہ آتا ہے۔ اس مکالمے کو آپ مکالمے کے کالم میں لکھ سکتے ہیں۔ جیسے بوڑھا گھڑی سے کہتا ہے۔

مکالمہ تو بھی میری طرح ہے ایک کونے میں پڑا ہوا۔ کوئی گرد صاف کرنے بھی نہیں آتا۔ تجھے تو بہت پہلے بند ہو جانا چاہیے تھا۔ کہیں تجھے میری دھڑکنوں کے بند ہونے کا انتظار تو نہیں!

اگر مکالمے کے کالم میں آپ نے یہ مکالمہ درج کر دیا اور اب آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز بھی جاری رہنی چاہیے تو آپ تاثر یا آواز کے کالم میں اسے درج کر سکتے ہیں۔ اس طرح پوری اسکرپٹ منظر نامے، مکالمے اور تاثرات کے ساتھ تیار کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اسٹوری بورڈ تیار کر لیں تو پھر ہمیں کیسا منظر شوٹ کرنا ہے یہ تصور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اسٹوری بورڈ میں شاٹ نمبر/شاٹ سائز کے ساتھ متعلقہ منظر کو گرافکس کی مدد سے کاغذ پر اتارا جا سکتا ہے۔ مکالمے اور تاثرات کا کالم اسی طرح ہوگا۔ شاٹ سائز میں کلوز اپ، مڈ شاٹ، لانگ شاٹ، پینٹنگ وغیرہ کی

تفصیل اسٹوری بورڈ پر درج کرسکتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری اپنی تکنیکی بندشوں کے باوجود خالص تخلیقی عمل ہے۔ اگر تصور واضح ہے اور فن کار اس فن کے لوازمات سے بخوبی واقف ہے تو اس کے لیے پروسس بہت معنی نہیں رکھتا ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ ایک بھی ایسا عمل نہیں ہے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ نہیں گذرے گا۔ یہ فرق ضرور ہوگا کہ وہ اپنے طریقے سے اسکرپٹ کو ایک روپ دے گا۔

ٹیلی ویژن اسکرپٹ نگاری ایک مکمل فن ہے۔ تکنیکی لوازمات سے واقف ہونے والوں کے لیے یہ خواب کی تعبیر جیسا فن ہے۔ یہ وہ فن ہے کہ غالب کا یہ شعر زندہ تصویروں کی صورت ہمارے وجود پر حاوی ہوسکتا ہے ع

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

انجم عثمانی

اردو اور ٹیلی ویژن

برصغیر میں ٹیلی ویژن اپنے تاریخی ارتقا میں روایت ساتھ لے کر چلا وہ فلم اور ریڈیو کی روایت تھی جس میں طبعی اور تاریخی طور پر اردو کا عمل دخل شروع سے تھا۔اردو کی ہمہ گیری، گہرائی، اشاریت و بلاغت، شیرینی وحسن اور سب سے بڑھ کر اس کی عوامیت ٹیلی ویژن کے خوب کام آئی، آج بھی آرہی ہے بلکہ اس کی ضرورت اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات اس لیے نہیں کہی جارہی ہے کہ مادری زبان کی محبت کے چشمے سے ارتقا زیادہ اور زوال کم نظر آتا ہے بلکہ اس لیے کہی جارہی ہے کہ یہ ایک ناقابل تردید، خوش کن حقیقت ہے اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔

یہ زمانہ تخصیص اور اختصار کا زمانہ ہے۔ فرصت کے لمحات اور ضروریات زیادہ ہیں اور اردو ایک ایسی جامع زبان ہے کہ اختصار اور تاثر پذیری اس کی ذاتی خصوصیات ہیں اور تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے ہی رابطہ کی زبان ہے۔اب ایک مثال دیکھیں: ٹیلی ویژن کی مقبولیت کی موجودہ دور میں اشتہارات کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔اجتماعی ضروریات کی چیزوں سے لے کر انفرادی ضرورت کی معمولی سے معمولی چیز تک اشتہار کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔ظاہر ہے کہ ٹی وی پر اشتہار دکھانے اور دکھانے کے لیے بنانے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔کبھی کبھی تو سکنڈوں میں دکھایا جانے والا اشتہار لمبے لمبے پروگراموں سے کہیں زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مواد کھپا دینا ضروری ہوتا ہے اور اس جامعیت و اختصار کے لیے اردو موزوں ترین زبان ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی وقت ٹی وی پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو چند منٹ غور سے سن لیجیے، ممکن ہو تو ان میں بولے جانے والے الفاظ کو کاغذ پر لکھ لیجیے آپ پائیں گے کہ استعمال کی جانے والی زبان میں غالب عنصر اردو کا ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ روزمرہ کی بول چال کی زبان ہوگی، بولے جانے میں کیونکہ رسم خط کا مسئلہ نہیں ہے اس لیے بات اور بھی آسان ہو جاتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اشتہارات لکھنا ایک پروفیشنل معاملہ ہے اور کسی حد تک تکنیکی بھی لیکن خیال کو لفظوں میں ڈھال سکنے والوں کے لیے یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے، بس ذرا سی مشق اور معلومات سے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔اگر ٹی وی ایڈورٹائزنگ کی دنیا کو قریب سے دیکھیں تو اشتہارات

سننے والوں کے لیے اردو زبان کا جاننا پیشہ ورانہ ضرورت ہے جنھیں بعض تحفظات یا تعصبات کی وجہ سے وہ اس کو اردو زبان نہ کہتے ہوں۔

یہ تو ٹی وی میڈیم میں اردو زبان کی اہمیت کی صرف ایک مثال تھی ورنہ ذرا غور کیجیے کہ انگریزی اور علاقائی زبانوں کے علاوہ جتنے پروگرام بھی ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں انھیں چاہے کسی بھی وجہ سے عنوان کچھ بھی دیا جاتا ہو، ان سب میں اردو کا استعمال ناگزیر ہے۔ اور جب سے سیٹیلائٹ پرائیویٹ چینل شروع ہوئے ہیں تب سے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اردو کا جتنا فروغ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کے ذریعے ٹیلی ویژن کا فروغ ہوا ہے۔

ٹی وی میڈیم میں اردو کے مسئلے کو اردو کتابوں کی اشاعت، اردو پڑھنے لکھنے والوں کی کمی وغیرہ جیسے مسائل سے ذرا مختلف طریقے پر دیکھنے کی ضرورت ہے جنھیں اردو زبان اپنی بنیادی خصوصیات اور رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے زیادہ بہتر طور پر پورا کرتی ہے۔ ویژول میڈیم اور اردو تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے فلموں نے ہمیشہ اس زبان کے ذریعے مقبولیت حاصل کی ہے۔ آج بھی اردو کے اثر سے کلیتاً مبرا ہو کر نہ فلم مقبول ہوتی ہے نہ ٹیلی ویژن کا کوئی پروگرام۔ بات زبان کی ہو رہی ہے تو اردو شعر و ادب اور ٹی وی کے حوالے سے بھی کچھ باتوں پر غور کرلیں۔

شعروادب کی مختلف اصناف سے بھی اس میڈیم میں بہت فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ غور کیجیے کون سا ایسا مقبول سیریل ہے جس میں اردو کے مکالموں (ادب) کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ شاید ہی کوئی ایسا مقبول سیریل ہوگا جس کا ٹائٹل سونگ اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کا مرہون منت نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان اور شعر و ادب کا ڈکشن، سیریلز کے اسکرپٹ کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

میں یہاں جان بوجھ کر ان پروگراموں کی بات نہیں کر رہا ہوں جو بلاواسطہ اردو شعر وادب سے وابستہ ہیں بلکہ میں ان پروگراموں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو روایتاً اردو کے پروگرام نہیں کہلاتے لیکن اس سرمایے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں بھلے ہی وہ اسے اردو کا نام نہ دیتے ہوں۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ویژول میڈیم کی تکنیکی ضرورتوں میں زبان کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ تصویر نے لفظ کی اہمیت اور ضرورت کو بہت کم کر دیا

ہے۔ تکنیک کے حوالے سے عام طور پر غلط فہمی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ غور کیجیے ٹی وی پروگراموں کے پچھ فارمیٹس سے قطع نظر کیا کوئی ایسا پروگرام ہوتا ہے جس میں لفظ استعمال نہ ہوتے ہوں۔ اس میڈیم میں استعمال ہونے والے تقریباً ہر فارمیٹ میں بنے پروگرام کے پیچھے الفاظ ہی ہوتے ہیں اور یہ زبان ہی ہے جو تصویر کو زندہ رکھتی ہے۔

سیریل ہو، ڈرامہ، مباحثہ ہو یا خبریں، دستاویزی فلم ہو یا چند منٹ کے اناؤنسمنٹ تقریباً ہر پروگرام کے لیے زبان کی ضرورت ناگزیر ہے اور الفاظ کے معانی، ان کے اتار چڑھاؤ اور ان کے پس منظر سے کماحقہ واقفیت کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اور علاقائی زبانوں کے علاوہ وہ باقی تقریباً ہر پروگرام میں اردو زبان کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اب رہی بات تکنیک کی تو فنی زمانہ تکنیکی افراد کے لیے عام طور پر اور ہدایت کار، کیمرہ مین، ایڈیٹر اور گرافکس ڈیزائنر کے لیے خاص طور پر اردو زبان کا جاننا بے حد مفید ہے بلکہ بہت سے کام ایسے ہیں جو زبان جانے بغیر تکنیکی طور پر بھی ٹھیک نہیں ہوسکتے۔ مثلاً اگر ایڈیٹر کو یہ خبر نہ ہو کہ مصرع کہاں ختم ہوا تو وہ اس منظر کو خود ایڈٹ نہیں کرسکتا، اگر کیمرہ پرسن کو زبان نہ آتی ہو تو وہ اس زبان کی تہذیب سے مطابقت رکھتے ہوئے زاویوں کا استعمال نہ کرپائے گا۔ کیونکہ ٹی وی میڈیم میں بیشتر تکنیکی کام تخلیقی اور تخیلی قوتوں سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ان کو صرف مشین آپریٹر نہیں کہا جاسکتا بلکہ مشین کا تخلیقی استعمال ہی تکنیکی لوگوں کو ممتاز، ماہر اور مکمل بناتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ٹی وی میڈیم کی ہر صنف نے اردو زبان و ادب اور شعری سرمایے کا استعمال کیا ہے۔ کررہے ہیں اور جب تک اس کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کیا جاسکے گا یہ اس کا استعمال اور جہاں جہاں موقع ملے گا استحصال کرتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ جب ٹی وی کی مقبولیت اردو کے کاندھوں پر چڑھ کر مسلسل اپنا قد بڑھا رہی ہے اور اس کا اثر و نفوذ درونِ خانہ تک سرایت کرگیا ہے تو اسی کی اثر پذیری کا ایک ایک مضبوط سبب اردو زبان کا اثر نفوذ اتنا کیوں نہیں ہے یہ ٹیلی ویژن گھر کے اندر اردو گھر سے باہر، بے خانماں کیوں ہے اسی سوال کا جواب بڑی حد تک اس سیاسی اور صارفیاتی نظام میں پوشیدہ ہے جو زبان ہے یا تہذیب، شخصی ہو یا سماجی ہر شے کو صرف مادی فائدوں بلکہ محض مادی فائدوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہندستان میں ٹیلی ویژن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ

جب یہ میڈیم مقبول ہو گیا (اور اس کی مقبولیت میں جیسا کہ عرض کیا گیا اردو زبان کا بڑا حصہ ہے) تو اس پر تاجروں نے قبضہ جمالیا جن کا مقصد ہر طریقے سے اپنی مصنوعات کو بیچنا اور دولت کمانا ہے۔ جن کی اخلاقیات، جن کے ایمان، جن کی وفاداریاں صرف اور صرف تجوری کے ساتھ ہیں۔ معاملہ مقاصد اور نیت کا ہے صاف ہے اپنے پروڈکٹس بیچنے کے لیے انھیں اردو کی ضرورت ہے۔ بیچنے کے لیے انھیں صابن کو صابنوں کہنا پڑتا ہے۔ تیل کو تیل، اس لیے وہ لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ زبان، زبان سے وابستہ تہذیب اور اخلاقیات ان کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ اس لیے صابون تو خوب بکتے ہیں مگر نہانے کی تمیز اور املا نہیں آتا۔ جبکہ کوئی بھی عوامی ذریعہ ابلاغ ہو اسکا استعمال عوام تک ارفع خیالات پہنچانے، تطہیر نفس، صحت مند تفریح اور صحیح معلومات کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ ایجادات رحمت ہیں لیکن تاجرانہ ذہنیت نے ان ایجادات کو عیاشی اور زحمت بنادیا ہے اور اس کے لیے وہ ہر اس ذریعے کو استعمال کرتے ہیں جو فوری طور پر عوام سے رابطہ قائم کرا کے اثر انداز ہو سکے بھلے ہی وہ اردو جیسی پاکیزہ زبان ہی کیوں نہ ہو۔

صاف ظاہر ہے کہ ہندستان میں ٹیلی ویژن نے اردو زبان سے بہت کچھ لیا ہے، اس کے ادب اس کی شاعری اسی کے ڈکشن اور اس کی عوامی رابطیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے مگر یہی میڈیم اس زبان اور اس سے وابستہ تہذیب اور اس سے متعلق افراد سے لاتعلق ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ آپ آم کھائیے پیڑ نہ گنیے، اردو کا استعمال ہو رہا ہے اور بہت ہو رہا ہے پھر شکایت کس بات کی۔ مگر "آم کھانا اور پیڑ نہ گننا" والی بات پر عمل کرتے کرتے ہم نے اپنے باغ ہی گنوادیے ہیں نتیجہ یہ کہ ادھر تو یہ عالم کہ اردو کے جسم کے ہر ہر قطرے سے صابون اور تیل بنا بنا کر دولت کے انبار لگائے جارہے ہیں اور ادھر یہ حالت کہ ہم اردو والوں نے اس میڈیم میں پیشہ ورانہ طور پر جگہ بنانے کے لیے سنجیدگی سے سوچنا بھی شروع نہیں کیا ہے۔ اب پتہ نہیں کہ فضا ہی زخمی ہے یا آنکھوں میں زخم آگئے ہیں کہ منظر تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔

آج کا یہ سمینار اگر حالات کا تجزیہ کر کے ہم لوگوں کو مثبت عمل پر آمادگی کی طرف ایک آدھ قدم بھی لے جائے تو یہ بڑا کام ہوگا ورنہ مضامین لکھنا، سنانا اور ہر مذاکرہ کے بعد اگلے مذاکرے تک مراقبے میں رہنا ہے تو پھر کسی سے کیا شکوہ۔ آخر میں میر جی کی زبان میں:

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

اردو اکادمی دہلی

کی چند اہم مطبوعات

دلّی والے (جلد چہارم)
مرتب: اظہار عثمانی
قیمت: ۱۲۰ روپے، صفحات: ۳۴۰

اردو میں پاپولر لٹریچر روایت اور اہمیت
مرتبین: ارتضیٰ کریم، اظہار عثمانی
قیمت: ۱۲۰ روپے، صفحات: ۲۳۹

آغا حشر کاشمیری عہد اور ادب
ترتیب: ارتضیٰ کریم
قیمت: ۲۰۰ روپے، صفحات: ۳۷۶

مشاہیر کی آپ بیتیاں
مرتب: عظیم الشان صدیقی
قیمت: ۷۵ روپے، صفحات: ۲۲۴

آج کی سائنس
مصنف: اظہار اثر
قیمت: ۱۰۰ روپے
صفحات: ۲۲۰

خدنگ ناز
شاعر: شیر سنگھ جین ناز دہلوی
قیمت: ۷۵ روپے
صفحات: ۱۸۴

اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ
مرتبہ: پروفیسر صغرا مہدی
قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۲۶۸

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت
مرتب: ڈاکٹر خالد محمود
قیمت: ۱۵۰ روپے، صفحات: ۶۵۰

بیسویں صدی کے شعرائے دہلی
مرتب: عظیم اختر
قیمت: ۳۲۵
صفحات: ۱۳۸۹ (دو جلدوں میں)

طرز خیال (تنقیدی مضامین)
مصنف: پروفیسر محمد حسن
قیمت: ۸۰ روپے
صفحات: ۳۹۲

اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے
مرتب: ارتضیٰ کریم
قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۳۴۰

کفِ گلفروش
(قرۃ العین حیدر کا فوٹو البم)
قیمت: ۵۰۰ روپے
صفحات: ۱۳۰۰ (دو جلدوں میں)

دلّی والے (جلد سوم)
مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین
قیمت: ۷۵ روپے
صفحات: ۲۷۲

گوپی ناتھ امن
مرتب: دھرمیندر ناتھ
قیمت: ۷۰ روپے
صفحات: ۱۷۶

باقیاتِ بیدی
(راجندر سنگھ بیدی کی غیر مدون تحریریں)
ترتیب: ڈاکٹر شمس الحق عثمانی
قیمت: ۱۵۰، صفحات: ۴۶۸

دیوانِ غالب
(صدی ایڈیشن، اردو۔ ہندی)
مرتب: علی سردار جعفری
قیمت: ۳۰۰ روپے، صفحات: ۴۷۲

دہلوی اردو
مصنف: سید ضمیر حسن دہلوی
قیمت: ۹۰ روپے
صفحات: ۲۷۲

انتخاب کلام آغا شاعر قزلباش
مرتب: سید فیضان حسن
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۹۶

بستیاں (منتخب افسانے)
افسانہ نگار: جوگندر پال
قیمت: ۵۰ روپے
صفحات: ۲۱۴

اردو کلاسیکل ہندی اور انگریزی ڈکشنری
مرتب: جان ٹی پلیٹس
قیمت: ۳۰۰ روپے، صفحات: ۱۲۶۰

اردو شناسی (قاعدہ)
پیشکش: اردو اکادمی، دہلی
قیمت: ۶ روپے
صفحات: ۳۲ (تیسرا ایڈیشن)

دلّی اور طب یونانی
حکیم سید ظل الرحمٰن
قیمت: ۸۰ روپے
صفحات: ۴۱۷

شہید
ناول نگار: ملک راج آنند
قیمت: ۴۵ روپے
صفحات: ۱۱۲

اردو نظم ۱۹۶۰ کے بعد
پیشکش: اردو اکادمی، دہلی
قیمت: ۵۰ روپے
صفحات: ۱۱۲

میلوں لمبا پل (منتخب افسانے)
مصنفہ: راجی سیٹھ
قیمت: ۴۰ روپے
صفحات: ۱۲۶

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور کارنامے
مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ
قیمت: ۷۰ روپے، صفحات: ۲۳۰

ہند اسلامی فن تعمیر
(دو جلدوں میں)
مرتب: صہبا وحید
قیمت مکمل سیٹ: ۲۰۰ روپے
صفحات: ۵۷۸

اس آباد خرابے میں
خود نوشت سوانح: اختر الایمان
قیمت: ۶۰ روپے
صفحات: ۲۴۴ (دوسرا ایڈیشن)

رابطہ: سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی
Ph : 23863858, Fax : 23863773